(1)

مانند دریا ہے زیست سمندر تک رواں
جب تلک ہے نفس ساحلؔ تب تلک ہے جاں

کر لے تُو تلف جو چاہے، نظام سب مولیٰ کا ہے
نیلا ہے نیلا رہے گا، اے بندے تیرا آسماں

دل کس کا جل رہا ہے ، سلگتی نار سے پُرسش کیا
دل نہیں تو راکھ کیا ہے، تُو ہی بتا، اے دُخان

ہے حسرتوں کا مجموعہ، کہتے ہو تم انساں جسے
آئینے میں دیکھ کر خود کو وہ ، ہوتا ہے عبث پریشاں

خوشامدیں کیا کرنیں ساحلؔ، یکساں ہیں جب بندے سب
غفور تو سب کا ایک ہی ہے، سب کا وہ داتا رمہرباں

یہ کس کی غلطی ہے، ریائش یہ کس کی ہم کیوں چلتے آئے، خواہش یہ کس کی
محبت جذبہ ہے وفا کا، جانم محبت میں پھر آزمائش یہ کس کی
تکتے ہو تم ماہ و انجم کو، پھر گفتگو ہم سے، ستائش یہ کس کی
گل، چمن میں حسیں تھا کبھی کھلا ہوا آج زلفوں میں گل ہے، آرائش یہ کس کی
شیخ، دستارِ مفلساں کیوں سر پر تیرے دِکھا کیا رہا ہے، نمائش یہ کس کی
صبح تا شام ہمسفر تھا، آفتاب اب ستارے ہیں ساتھ، سازش یہ کس کی

انجام ہے فنا، تجھے فکر کیا ہے ساحلؔ
دور پیری کا ہے، پھر کاہش یہ کس کی

امتحان نہ لو میری آرزو کا　　میں تو منتظر ہوں کسی عدو کا
مانا، جھونکے نسیم کے ہیں دلکش　　بے حجاب ہو جانم، پاس کرو تم آبرو کا
ذہن نہیں، دل ہے زباں محبت کی　　فائدہ نہ اُٹھاؤ تم رات کی گفتگو کا
یوں شب کو نکلو گی تو ماند ہوگا چاند　　کیا ہوگا بتاؤ، پھر اظہارِ جگنو کا
دوستو، ضبطِ گریہ کی نہ دو ہدایت مجھے　　بہیں نہ اشک میرے، کیا ہوگا رواں جو کا
مقام تیرا اپنا ہے، اے خزاں، پر　　سمجھاؤں کیسے دل کو حال رنگ و بو کا
کہاں تک مناؤں آوارہ دل کو میں　　یارو بتاؤ، کیا ہوگا میری خو کا
اے جوئے رواں، تُو ٹھہر جا ذرا　　پاس کر، لب پر بیٹھے اُس سکوت جو کا

ساحلؔ منتظر تھا اقبالؔ حقیقت کا، لیکن
گر مل جائے ساحل تو کیا ہوگا جستجو کا

جو دل میں آئے ساحلؔ وہی کام کر
رواں دریا کی مانند ارقام کر

نہیں ہوتا ہے کچھ بھی بن قصد کبھی
اے بشر،تُو زخموں کا معافی سے التیام کر

جنوں کا ہونا بھی ضروری ہے ساقی
تُو جام میں ڈوبنے کا انتظام کر

تہہ خانہ تو نشیمن ہے ابلیس کا
اے بندے، جو کرنا ہے، سرِ بام کر

بھولی ہے یہ دنیا نام عزت کا آج
اے بشر، تُو انساں کا احترام کر

اُفق کو دیکھ،غروب ہو چلا ہے آفتاب
کار اپنے تُو مسافر، سر انجام کر

تفریق کیسی، خدا تو سب کا ایک ہے
تُو ہر آستاں پر ساحلؔ، جا سلام کر

کھنڈر سے گفتگو کیسی ، جب خود ہی بے جان ہو
زندہ ہو گر دل تو پھر، گفتگو آساں ہو
بے شک بے زباں ہے، بے حس نہیں ہے پتھر
گر دیکھ سکو تم آنسو، تو گفتگو آساں ہو
اُٹھتے ہیں ولولے بے ساختگی سے جب
خموش ہوتی ہے صدا، درد ہو یا فغاں ہو
مچلتے تھے ارماں کبھی، بیتبانہ، یارو
اب روتا ہے بے بس دل، کاش کوئی ارماں ہو
مت بھولنا تُو ساحلؔ کبھی، رشتہ جبل و دریا کا
پتھرا گر نہ روئے تو، دریا کیونکر رواں ہو

جلوہ تنہائی کا

کبھی یہاں بھی بیٹھ کر دیکھ لو　　سنو گے تم دل کی صدا
تنہائی میں، اے ساحلؔ میاں　　نہیں ہوتا ہے انساں، خود سے جدا
کبھی یہاں بھی بیٹھ کر دیکھ لو

پاؤ گے تسکین کمال کی　　دل بنے گا نغمہ ساز
خموشی سے آکر ملو　　دیکھو نخرہ، اُس کا ناز
پاؤگے تسکین کمال کی

سارا جہاں اسی میں ہے　　نہیں ہے منزل اور کوئی
کشتیٔ زیست ہے گرداب میں　　نہیں ہے ساحل اور کوئی
غضب کی ہے یہ تنہائی
کبھی یہاں بھی بیٹھ کر دیکھ لو

اُجالے کی نہیں ، بات ہوتی ہے اندھیروں کی
حقیقت سے بعید یہاں خرافات کی
میرے الفاظ کیا دیں گے میرے ہونے کی گواہی
جب زمیں خود ضامن ہوگی، اِک روز اس بات کی
منتظر رہتی ہے زندگی، فنا کی سر تا سر
اس آخری سانس کی، وہ ظلمت بھری رات کی
مومن کو کیوں آتے ہیں خیال کافرانہ
ساقی، کیا یہ آس ہے تیرے خرابات کی
جب زندگی خود کرتی ہے باتیں نجات کی
کوئی تو سمجھاؤ یارو، اہمیت کائنات کی
بے محابہ ہے اتنا اس دور کا انساں
مت کرو مجھ سے باتیں تم محابات کی
ہنگامۂ زیست نے کئے ولولے خموش
کیوں کرتے ہو ذکر یارو اب لطفِ جذبات کی
گر پیکرِ غزل بنا لے زندگی کو ساحلؔ
محسوس نہ ہوگی ضروت، تجھے قلم ودوات کی

آج یہاں کل وہاں، یوں ہی رواں ہے کارواں
پھر دیکھئے نار کو، اور اُڑتا سا اُس کا دھواں

ساتھ رہ کر وقت بتانا، لازم ہے اے ساحلؔ دوست
کسے کہیں گے ٹھکانہ، اور کسے ورنہ آشیاں

خانہ نشیں کیا، خانہ بدوش تُو ہے یار
منزل جب سراب تھی، باندھے کیوں تُو نے پیماں

چلے جب گھر سے ساقی، ظلمت بھری یہ شام تھی
طلسم محفل کی سمجھا، سحر سا کیسا یہ سماں

دل کے داغ رکھ پنہاں، ظالم ہے یہ دور بہت
کسے خبر کون چاک کرے، اے بسملؔ، تیرا یہ داماں

مہرے اور پیادے ہیں سب، سب کی چال ہے اپنی
بساطِ زندگی سے بہتر، شطرنج ہے آساں

اے وحدانیت کے قائل، یہ زمیں بھی تو اسی کی ہے
جس جا پر بیٹھا ہے تُو ساحلؔ، وہی ہے آستاں

تخلیقات اُسی کی ہے، ہم ندی وہ بحر
ترسا اور یہود کون، کون برہمن کون مسلماں

مسلط ہے انساں، انساں پر آج
ماہ پر داغ ظاہراً نہیں ہے

دوسروں کے سرو ساماں پر آج
کے داغ ہے سب،اس کے داماں پر آج

دولت پرستی کا شکار ہے یہ
غلام انا کا ،انداز کافرانہ

جانے کہتے ہیں کیسے ہونہار ہے یہ
خیالی گھوڑوں پر سوار ہے یہ

اسے پروانہ نہیں کسی بات کی بھی
ستم رسیدہ ہے حیات

صبح امروز، آئندہ رات کی بھی
اسے فکر نہیں ہے کائنات کی بھی

کون سمجھائے گا اسے، کہو
یہ زیست نہیں کار زار ہے اب

کون بچائے گا اسے ، کہو
کون پہنائے گا چادر، کہو

اے بشر تُو جینا اور مرنا سیکھ
خضوع سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے

سر جھکا کر چلنا سیکھ
یاد خدا کو کرنا سیکھ

یہ انساں بہت دیوانہ ہے
بھیج پیامبر خدایا تُو

وحشت دزہ یہ زمانہ ہے
گر، جہاں کو تجھے بچانا ہے

ذہن کو سمجھایا لاکھ، ارماں کہاں مانتے ہیں
کب رکا ہے رواں دریا، ہم تو اتنا جانتے ہیں
کر لو بحث، فراست مندو، جہاں کی اصلیت پر
ہم تکتے ہیں فلک کو روز، حقیقت ہم جانتے ہیں
تُو دل فریب ہے زندگی، میرے دل کا آئینہ کہتا ہے
اور منتظر ہے تھکتا نفس، اجل کا ہم مانتے ہیں
کتنا گہرا ہے سمندر، پوچھتا کیوں ہے، کشتی سوار
پاسباں ہے خدا تیرا، طوفاں یہ جانتے ہیں
بتا لے دوست زندگی لمحہ بہ لمحہ، اے ساحلؔ
مفہوم کو جستجو فلسفہ کی، ہم خوب اسے جانتے ہیں

محلوں میں رہ کر بھی انساں غریب ہے　　سوچ ساحلؔ یہ بات کتنی عجیب ہے
خوشی تو رہتی ہے ذر سے کوسوں دور　　تسکین، کون جانے کس کا نصیب ہے
نہ ستارے فلک کے نہ چمن کے گُل　　اصلی دولت تو یارو صبرو شکیب ہے
شہیدوں میں شہید تو مسیحا تھا　　قربانی کی مثال تو صلیب ہے
درس دے کوئی تو اسے ضبطِ سخن کا　　یارو، پھسلتی بہت ہے، ظالم یہ جیب ہے
کارزار ہے زندگی مقابلہ کرتے رہو　　فلسفے کے لئے تو بہت کافی خطیب ہے
کشتی کو سنبھالے ناخدا، دوستو　　جہاں کا پاسباں، تو مولیٰ رقیب ہے

کیوں آتے ہیں خواب جنت کے بار ہا
ساحلؔ، کیا بارگاہِ خدا، اب قریب ہے

تنہائی کو ساحلؔ پھر انجمن بنا لو
دشمن نہیں تو، خود کو دشمن بنا لو

گُل ہو نہ گلشن اور نہ باغباں کوئی
تم اپنے ہی دل میں، اِک چمن سجا لو

کائنات کا مالک بس مولیٰ ہی ہے
تم آنکھوں میں اپنا، گگن بسا لو

ہر جا ہے خار، یہ گلستاں کیسا
نظر سے، خار کو ثمن بنا لو

نہ اُٹھ سکو گر اُداسی سے اپنی
پھر، اپنے ہی تبسّم سے من بہلا لو

دو دھاری زبان کو میان میں رکھو
ماحول کو اپنے ضوفگن بنا لو

غربت میں بھی فراموش نہ ہو نا
یہ خاک ہے تمہاری، اپنا وطن سجا لو

سمیٹتے ہو کیا کچھ، حیات میں تم یارو
جانا ہے ہاتھ خالی، اپنا کفن بنا لو

ساحلؔ، تراش لو ذہن میں اقدار پرانے
دشوار ہے جدّ ت ، اسے کہن بنا لو

کام، نام اور انجام، یہ سب طے ہے　　صاحب کون، کون بی بی، غلام بھی طے ہے
محنت، مشقّت، آرام طے ہے　　کیا ہے مباح، کیا حرام، بھی طے ہے
کس پیشرفت کی بات ہو رہی ہے، بندے　　جب زمین کا حاکم، آسماں بھی طے ہے
کیوں پوچھتا ہے فاصلہ منزل تک کا، راہی　　جب عمر معیّن ہے، گام بھی طے ہے
طے کر لے منزلیں، آئیں جو روبرو　　آغاز ہے مقرر، فرجام بھی طے ہے
کیا ہوگا حاصل، کیا ہوگا انجام　　مہر خدا کی، انتقام بھی طے ہے
زندگی تُو جی، نشیب و فراز سے مل　　بادِ مرگ ساحلؔ دوام بھی طے ہے

شاید پھر تسکین ملے، من کو ہو آرام
یہاں تو ہر شے کا یارو، دام بھی طے ہے

چمن کا پاسبان ہے اُسی کا باغباں
خاک ہوں گے گُل و خار، باغبان رفتگاں
آج فلک پر ماہ و انجم، کل ہوگی شبِ تار
سنیں گے پھر اُنہیں کی ہم، کسی سے داستاں
بے نیاز و بے پروا، نہ وقت پرستش کے لئے
اے لا ابالی انساں، تیرا رویّہ ہے گریزاں
کب تلک رہے گا زمین پر، اے انساں
منتظر ہے ہر لمحہ، دیکھ، مضطرب آسماں
کیوں کوستے ہو قسمت کو، لوگو بتاؤ
ظالم نہیں ہے وقت، ہے وہ مہرباں
جب ہو گی مغفرت ہر حال میں، اے بشر
گناہ تسلیم کر، گر ہے اس پر تُو پشیماں
جب تلک نہ جانے گا حقیقت کو تُو انساں
یہ من رہے گا اُداس اور دل تیرا گریاں
کیوں چاہتا ہے لے جانا، فضول تُو اپنے ساتھ
مجازی لباس کا چاک دامن اور اُسکا گریباں

نہ رکنا تُو ساحلؔ کہیں وقت نہ رُک جائے
چلتے رہنا گام بہ گام، مثلِ دریا، رواں دواں
پیری بھی مرحلہ ہے زندگی کا، دوست
نہ سہی جوانی ساتھ، پر تُو نہیں ہے ناتواں
ابھی تو خورشید فلک پر ہے ہمسفر تیرا
کیسے ہوں ماہ و انجم تُو ہی بتا، عریاں

کمسن وہ بہت شام تھی، شب کی وہ غلام تھی
میکدے میں تیرے ساقی، رونقِ گلفام تھی

نہیں بنے گا ولی تُو، انساں ہے انساں ہی رہ
قصد کیوں کی ساحلؔ تُو نے، جو آغاز سے ہی ناکام تھی

بھٹکتے رہے زمیں پر، بیہوش و حواس ہم
جس شے کی تھی جستجو، وہ تسکیں سرِ بام تھی

رواں رہا وہ مستقل، سمندر تک دریا
اساس اُس کی پختہ تھی، کہ تمنائے دوام تھی

ڈنکے بجائے دروغ نے، جا کر گلی گلی
خموش رہی بے بس صداقت، وہ جو بدنام تھی

کس کام یہ شان و شوکت، یہ کاخ و گلزار، یارو
یاد آتی ہے آج بھی، وہ تنہائی جو گمنام تھی

خود ہی میں وہ دور، ہر طور سے مکمل تھا
نمکین تھی وہ زندگی، جو وقت کی نہ غلام تھی

وقت لگا سمجھنے میں، اے ساحلؔ ہمیں ضرور
کیا تھا مباح جہاں میں، اور کون سی شے حرام تھی

استہزا نہ کرو یارو کہیں رو نہ پڑوں
بہتے آنسوؤں کو پھر کیا شبنم کہو گے
یا جتاتے ہمدردی اُنہیں اشکوں کو پھر
میرے زخموں کا اُنہیں تم مرہم کہو گے
مانو آئے گر چہرے پہ، تبّسم کبھی
مسرت کہو گے خواہ علامتِ غم کہو گے
ٹوٹے ہوئے جام اور بکھری ہوئی مئے
ساقی، اِسے رونقِ محفل یا درہم کہو گے
پیالہ جو دِکھائے نیرنگیِ عالم کا
فسوں گر کہو گے، یا جامِ جم کہو گے
مانے جو بات ہر آن تمہاری
اُسے غرض مند کہو گے یا ہمدم کہو گے
ساحلؔ، روٹھی ہے بلبل جانے ہم سے کیوں
تم بھی کیا ہمیں صنم نہیں کہو گے

سِوا رب کے جہاں کو کون سنبھالے گا
جو لکھی ہے اُس نے، اُسے کون ٹالے گا
ہمّت نہ ہارے جو طوفانوں کے آگے
وہ رب کی رضا سے تقدیر کو منالے گا
جس کے روشن ہو دل میں تجلّیِ خدا
وہ ویرانی میں دل کو، ہر حال سجالے گا
یاد رہے دوستو وہ پاسباں ہے سب کا
مومن کو غفلت سے وہ بچالے گا
یارو، کیا کرنی ہے محفل جنازے کے لئے
ساحلؔ خود کو بھی کاندھے پر اٹھالے گا

کیا کروں گا میں لے کر یہ دوا، بتا
جب میرے مرض کا علاج، چارہ گر ہے دعا
نہ ملا گر صلہ میری التجا کا مجھے
تیری دوا کا ہوگا، پھر حشر کیا، بتا
کیوں رُکا ہے بتا، کارواں اے میر
خانہ بدوش کی آوارگی کو ہوا ہے کیا
روانی کی تھی جسے کل تلک، تمّنا
آج سمندر کی دوری، بنی حائل ہے کیا
بدلا نہ دشت وصحرا، نہ ماہ و انجم کوئی
مت سُنا تُو کہانی، کیا ہوا ہے، بتا
خیال تیرے بھی ساحلؔ عجب ہیں میاں
کبھی ناساز ہے طبیعت، کبھی جوانی رواں

ڈگمگائیں نے قدم ایماں سے کبھی
کاش، نکلے نہ ہائے زباں سے کبھی

زمیں پر بہت ہیں دُشواریاں
یارو، ٹکرائیں نہ ہم آسماں سے کبھی

ہوس دیکھی ہے، اے سمندر تیری
اب ملا دے دریائے رواں سے کبھی

ہزاروں سے ملے ہیں یارو ہر روز
کوئی تو ملا دو انساں سے کبھی

تھک گیا ہوں خدایا تنگ راہوں سے میں
دِکھا دے خدایا مجھے راہ آساں کبھی

بھولا ہے انساں، لباس اپنا ہی ساحلؔ
دِکھا دے اُسے، اُس کا چاک داماں کبھی

مت کرو باتیں تم دل کے خانوں کی
دفترِ الفت ہے ناکام ارمانوں کی

سیکھ لو یارو آداب میزبانی کے
پھر، کرنا باتیں تم مہمانوں کی

ذکر خضر کا، کبھی اکثیرِ حیات کا
کوئی شکل تو دکھاؤ مجھے جاوِدانوں کی

ہر کوچے میں گھومتے ہیں آج، ہوش مند
یارو، کوئی تو بات کرو بے گھر دیوانوں کی

جب کرتی ہے روشن حجاب کو قندیل
غلطی کیا ہے کہو معصوم پروانوں کی

ہر لمحے میں پنہاں ہے ایک زندگی
باتیں کرتے ہو دوستو تم زمانوں کی

خار تک نہیں، گلوں کا کیا کہنا
بے رحمی دیکھئے، حال کے باغبانوں کی

ساقی، نہ رند نہ جام نہ ہی مئے کہیں
تُو پوچھتا ہے کیفیت میخانوں کی

اُسے کیا ڈرائے گا کہو زلزلہ کوئی
جس کے دل میں تمنّا ہے آسمانوں کی

نہ دِکھاؤ اُسے تیور اپنے، طوفانوں
جسے عادت ہو پیہم امتحانوں کی

ماہ و انجم کی سیر اور گفتگو فلک کی
ساحلؔ، کوئی تو بات کرے یہاں کے انسانوں کی

جذبۂ محبت بھی اِک فتور ہے
نہ جانے کس کا یہ ظالم قصور ہے
حُسن بھی تو تیری عنایت ہے ضرور
مولیٰ، حُسن کے آگے دل مجبور ہے
چشم نہ گیسو، نہ بلبل کی صدا
یادِ خدا ہی دلوں کا سرور ہے
شب ہے تو ماہ و انجم کا نور ہے
صبح کا آفتاب گویا رب کا ظہور ہے
شبنم کیا گری آج دہانِ گلاب پر
مانو، حُسن کا چہرہ ہی مستور ہے
یہ ناز ونخرہ، یہ عشوہ تیرا، اے زیست
پوچھا جب مولیٰ سے، کہا اس نے غرور ہے
رخصتی جہاں سے ہوخموشی میں یارو
ساحلؔ،شیونِ جنازہ بھی کیادستور ہے

نوا، جرسِ شبگیر کی سُنو　　پھر، داستان رانجھے اور ہیر کی سنو
عندلیب کا گیت، لیلیٰ مجنوں کا پریت　　پھر، غزل سنو تو تقی میؔر کی سنو
لرزائیں قدم، ایماں ڈگمگائے　　ٹٹولو ذہن کو، اور ضمیر کی سنو
مشورہ دیتا ہے وقت ہر لمحہ　　ہمسفر ہے، اُس راہگیر کی سنو
پاؤں کی بیڑیاں بھی دیتی ہیں صدا　　اے آوارہ دل، اُس زنجیر کی سنو
لوگ رکھتے ہیں دل میں تصور خدا کا　　کوئی تو کہوان سے، اس تصویر کی سنو
اے منصف، رعب و داب شیخ کا　　کبھی تو مجھ جیسے دامن گیر کی سنو
مانا کہ ولی بھی کوئی مولیٰ تو نہیں　　یارو، ہے تو وہ مومن، اُس سفیر کی سنو

حسرت سے تک رہا ہوں، جہاں کو میں، ساحلؔ
جہاں دیکھو، شورِ دار و گیر ہی سنو

نہ سناؤ ترانے، نہ سہی　　نہ آؤ منانے، نہ سہی
ہم تنہا ہی بیٹھے اچھے ہیں　　نہ آؤ دل لگانے، نہ سہی
یادوں میں تازہ ہے وقت پرانا　　نہ سناؤ فسانے، نہ سہی
سو جائیں گے یارو، روتے ہوئے　　نہ آؤ تم سلانے، نہ سہی
شام ہوگی شب پھر سحر، بے شک　　نہ آؤ راہ دکھانے، نہ سہی
آفتاب ہمسفر ہے ہر گام، دوستو　　نہ آؤ جگانے، نہ سہی

مفہوم زندگی کا کیا ہے، ساحلؔ
نہ آئے کوئی سمجھانے، نہ سہی

شیریں ہے تیری زباں، مانا جانم، چشم قاتل تو ہے
کوئی تو سُن لو سُر میرے، یارو بے سُرا سہی، لیکن دل تو ہے
تُو ہے ساقی، میں ہوں، جام ہے نہ سہی ہجوم، رنگِ محفل تو ہے
زخم سِل بھی جائیں تو کیا ہوا دوستو، دل بے بس گھائل تو ہے
دفن کیا نغموں کو زمانے نے شُکر ہے جھنکارِ پائل تو ہے
نہ ملے منزل نہ سہی، یارب تیری جستجو، آرزوئے منزل تو ہے
چھوڑ جائے زیست کبھی، تو کیا ہمسفر، وہ قضا ظالم تو ہے

سمجھتا ہے ساحلؔ زندگی، خوب
گنہگار سہی لوگو، عالم تو ہے

دریا کا پانی سمندر سے کم ہے
چلتے رہ ساحلؔ جب تک جاں و دم ہے

جیسے سورج رواں ہے صبح سے شام تک
نہ خوشی اُسے نہ ہی رنج و الم ہے

اُڑتے پرندوں کو دیکھو کبھی
اسمِ زیست ہے سفر، اور کیا لم ہے

پرکھا ہے تیرے خانوں کو، اے دل
کہیں سکوں اور کہیں غم ہے

اِک گل ہی کافی ہے، اے واعظ مجھے
وہی جنت، وہی میرا چمن ہے

دل کی صدا خموشی ہے ساحلؔ
وہی محبت کا ایک سخن ہے

مانگی ہے زندگی کی دعا جس نے میری
یارب، اُسی قاتل نے لی ہے جاں میری
ہر انساں کی کوشش، نقشِ پا رہیں قائم
کسے فرست ہے یارو، سُنے داستان میری
کیا کرتے ہیں لوگ جو چاہے دل
کس نے پوچھی ہے کبھی، کوئی ہاں میری
سُنا فیصلہ، منصف، سزائے موت دے
کر دے زندگی پھر آساں میری
ضبطِ سخن لازمی ہے ساحلؔ، آگاہ رہنا
کہیں چل نہ جائے شمشیر زباں، میری

دامن عشق کا تھاما ہے تیرے سوالوں کا نہیں
جانم، محتاج دل کا ہوں، تیرے خیالوں کا نہیں
زنجیر زلفوں کی مت بنا یار میرے
عاشق ہوں تیری سیرت کا، تیرے بالوں کا نہیں
آ مل کبھی جانم، میں ہمسفر ہوں تیرا
شائق ہوں تیرا، تیرے حوالوں کا نہیں
قہر سے لپٹ جانا، جبیں پر ہو شکن
انداز ہے یہ بے دل کا، دل والوں کا نہیں
جو اندھیروں میں کیا جائے سو خوفناک ہے
ساحلؔ، ڈر دروغ سے لگتا ہے، اُجالوں سے نہیں

غمخوار بن کر سمجھانے گئے
حیف ! بے نقاب دوست پہچانے گئے
شاخ سے گرتا تھا پتہ، صبا سہارے
افسوس ! اعتماد کے اب زمانے گئے
دُھن اپنی میں مست، راہ اپنی بنا کر
طوفانوں سے لڑتے دیوانے گئے
اٹھ گیا دل سے گر یقیں، یارو
پھر مندر اور مسجد، آستانے گئے
سمجھتے تھے تجھے ، ہم مجنوں کبھی
ساحلؔ،دل والے تو آج ویرانے گئے

وہ عاشق ہی کیا جو و یا نہ ہو　　وہ دامن ہی کیا جو دھویا نہ ہو
اُسے گُل کیا کہیں گے، کہو یارو　　جس کا تخم بھی تم نے بویا نہ ہو
کاندھا نہ دیا تو غمخواری کیا　　وہ بار ہی کیا جو ڈھویا نہ ہو
پاک کیا ہوگا وہ دامن کہو　　آبِ کوثر میں جو ڈُبویا نہ ہو

ضروری ہے ساحلؔ رہنا خفتہ
وہ جاگے گا کیا جو سویا نہ ہو

خون گل کا ہو یا چمن کا　　لہو ٹپکے گا ہر بدن کا
سُرخ ہوگا رنگ ہر خار کا　　ہر برگ و بار و سمن کا
دہشت نہ دیکھی جہاں میں ایسے　　رنگ، لال منظر کفن کا
نم چشم ہے باغباں کی　　تڑپے گا ضمیر اس زمن کا
کیا حال ہے ساحلؔ تُو ہی بتا　　تیرے پیارے سے اس وطن کا

پیش رفت کی دُھن ہے، یارو آج
کیا کہوں اس دشت و دِمن کا

کیا کِھلیں گے پھول اُس دشت و دِمن میں
کیا جاگے گا ضمیر انساں کے من میں
کم ہو گی کیا وحشت جہاں میں کبھی
کیا ہو گی کم کیفیت، دہشت کے فن میں
اے گنہگار، چشمِ نم ثبوت ہے
بندے، ویرانی ہے آج تیرے چمن میں
مایوس کیوں، اے باغباں سوچ
گل نہیں، خار اُگتے ہیں ابلیس کے تن میں
آج بھولا ہے بشر خدا کو، ساحلؔ
کوتاہی ہے بہت اس کی لگن میں

داستانِ ساحلؔ

یاد آتے ہیں اب بھی وہ دن پیچ و تاب کے
گزاری تھیں راتیں بن نیند و خواب کے

اندھیرے تھے ایسے ہر طرف میرے
گویا، فلک بھی دیکھتا تھا خواب مہتاب کے

چمن تھا خزاں تھی، بہار کے سراب تھے
دربدر پھرے، لئے تصّور گلاب کے

درس دیا مجھے کار زارِ حیات نے
دعا کرتے جاؤ، منتظر نہیں جواب کے

ستارا نہیں ہے تُو چمکے گا کیسے
چھوڑ کر اصل کو، نہ دوڑنا پیچھے سراب کے

کیوں بھولا ہے انساں ماہیت آداب کی
لگا ہے آج ڈھونڈنے میں ذریعہ اسباب کے

دوستو ہمّت نہ ہارا یہ ساحلؔ کبھی
ساحل کے طوفاں کیا ڈرائیں گے آب کے

کیا ہم نہ کہتے تھے غم بری بلا ہے　　کون کب کس سے خوشی سے ملا ہے
جبیں پر شکن، باطن میں طوفاں　　سکوں نہیں ہے جسے، دل میں گلہ ہے
یقیں نہیں ہے دوست مرہم پے تیری　　ورنہ اے چارہ گر، پانی سے کون کب جلا ہے
آجشک اور شبہ حاوی ہے، یقین ندارد　　کبھی کہتے تھے گھر جسے وہ قلعہ ہے
کچھ تو وجہ ہوگی اِس مضطرب ماحول کی　　ساحلؔ، کب پتہ بِن ہوا ہلا ہے

گر اٹھ بھی جائے اعتماد انساں سے، یارو
عرشِ بریں میں سب کا ، وہ مولیٰ ہے

نہیں آتی ہے جب وفا مجھے — مت بنا جانم تُو خدا مجھے
سُلگتا شعلہ ہوں، بُجھ جاؤں گا — مت دے تُو اب ہوا مجھے
کیا فائدہ تیرا، اے ضمیر بتا — راستی کی راہ پر چلا مجھے
مضطر ہے دل، علاج مشکل — بلبل، تُو ہی آ کر سُلا مجھے
آفتاب نے گر نہ اُٹھایا کل — تُو لے جا آ کر اے قضا مجھے

ایسا بھی فور کیا ہے ساحلؔ
تیرے حق میں کرنی ہے دعا مجھے

تم کو دیکھ کر طبیعت کچھ گھبرائی ہے — اے بہارو، لہد پر یہ کیسی آرائی ہے
چمن کی کریگا وہ سیر کیا کہو — خزاں کے لباس سے جسے شناسائی ہے
یہ سوزش آج کیسی، نغمۂ بلبل میں — جانے کس گھٹا کی اب، وہ خبر لائی ہے
شاخِ گُل مُرجھائے، تو نم چشم ہے حال — اُس رونقِ محفل سے بہتر، میری تنہائی ہے
یہ دل نہیں صحرا ہے گل کیا کھِلے گا — اے گل وخار میں جہاں مستقل لڑائی ہے
شام کو لطفِ جام، صبح کو دیر و حرم — ناصح بتا، یہ بھی کوئی پارسائی ہے
دیر و حرم نہ میخانے سے واسطہ — کوچے میں واعظ، بتا کیوں رسوائی ہے
دیکھو، کاسہ بہ دست فقیر بھی شادماں ہے — یارو، ہم نے امیری کی سزا کیوں پائی ہے

رہ جام وصبو وساقی سے دور، ساحلؔ
پارسائی میں ہی، تیری بھلائی ہے

جسے کہتا تو ساحلؔ میرا دشت و دِمن — وہی خزاں کا خزانہ ہے میرا چمن
بہتا ہے گر آبِ کوثر کہیں — تو میرے بھی در پہ ہے دریا، جمن
ہنگامہ ہے اتنا جہاں میں آج یارو — بات وہی کرو جس میں ہو کچھ وزن
سمجھ لو تم یارو کامیاب رہی زیست — کر ملے تمہیں کاندھا اُٹھانے کو کفن

ساحلؔ، زندہ ہے دل اور زندہ رہے گا
نفس میں جب تکمیرا حبِّ وطن

بے رخی دیکھئے آج میزبانوں کی　　فکر نہیں ہے انھیں مہمانوں کی
ادب سے محروم بشر کدھر جائے گا　　بات مت کیجئے لا احترام زبانوں کی
رحم دل نہیں ہے یہ زمانہ آج کا　　کسے فرصت ہے وہ سوچے، نذرانوں کی
پیر و مرشد، سنت و فقیر، حیف !　　یہ نہیں تو بات کیا آج آستانوں کی
ہر لمحے میں پنہاں ہے حیات کامل　　بات کرتے ہیں لوگ زمانوں کی
حسن کا حق ہے اترانا، یارو　　غلطی کیا ہے، معصوم پروانوں کی
ساقی نہ رند نہ خمگاہ کہیں　　کیا پوچھتے ہو دوستو، کیفیت میخانوں کی
ہے بے باک وہ انساں، اے طوفانوں　　جسے عادت ہو مسلسل امتحانوں کی

اُسے کیا ڈرائے گا کوئی زلزلہ، ساحلؔ
جس کے دل میں تمنّا آسمانوں کی

''دانہ خاک میں مل کر ہی گل و گلزار ہوتا ہے''

شیخ وہی، جو انکساری پر سوار ہوتا ہے
جہاں فانی ہے یہ جانتی ہے دنیا ساری
سمجھے اس بات کی ماہیت، وہ ہوشیار ہوتا ہے
محض گناہ کرنے والا ہی خطاوار نہیں
گناہ کے سوچنے والا بھی گنہگار ہوتا ہے
بلبل نہیں ہو جانم یہ تو مانا ہم نے
پر دل کے تار جو چھیڑے، وہ موسیقار ہوتا ہے
ساحلؔ کا سکوں باعثِ ارماں ہے، لیکن
حوصلہ تو ساحلؔ سمندر کے پار ہوتا ہے

ساحلؔ، خصوع میں ہی تخمِ مرہم ہوتا ہے
اے شیخ، تیرے جذبۂ ذِم میں کیا ہوتا ہے

واعظ بھی ساگر و مینا کی بات کرتا ہے
آج خدا جانے دیر وحرم میں کیا ہوتا ہے

اے فرشتۂ اجل، تُو ہی آ کر بتا
انسان کے آخری دم میں کیا ہوتا ہے

مسکراتے ہیں ہم طوفاں میں بھی، دوستو
کہو، تمہارے رنج و الم میں کیا ہوتا ہے

جب روٹھتے ہیں وہ صبح و شام ہم سے
پھر، فرق عدو اور صنم میں کیا ہوتا ہے

مارِ آستین سے رہنا خبردار، لوگو
کون نہیں جانتا، سانپ کے سم میں کیا ہوتا ہے

بہت چھوٹی سی ہے تیری دنیا، ساحلؔ
سنبھال لے، کیا خبر جامِ جم میں کیا ہوتا ہے

ملتا ہے سکوں تو عبادت میں مولیٰ کی خدمت و عبادت میں
کیا رکھا ہے یارو، تم ہی کہو آج کے درہم و رقابت میں
تھام لو ہاتھ پھر فراست کا بسر نہ ہو زیست عداوت میں
انساں وہی ظریفانہ ہے جو زیست گزارے ظرافت میں
کھیل قسمت کا ہے، تم کیا کروگے ہنستے رہو پھر شقاوت میں
آؤ بہاروں منتظر ہے چمن نہ رہے گا مستقل، تراوت میں

مبارک ہو اُس کو، اے ساحلؔ میاں
جسے ملتی ہو تسکین ، رفاقت میں

ہم نے میکدے میں عید منائی، آج　　کی دیر و حرم میں غزل سرائی آج
تعجب ہے کہ سموم بھی　　ہے بھیس بدل کر آئی آج
اے بادِ صبا تُو آئی تو ہے　　پر، کیا نوید کوئی ہے لاہی آج
چلتے آئے راہ اپنی پر ہم ، یارو　　جانے کس موڑ پر قسمت لائی آج

سمجھتے تھے سا حلؔ تقی میرؔ کو شہنشا ہ
جانے کس نے ہمیں، یہ غزل ہے سنائی آج

ساقی، نہ سہی نہ پلا تُو مئے ناب، آج
یہ بتا کیوں ہے خالی، ما بعد میں محراب، آج
آئے تھے تیرے در پہ لئے امید، ہم
کہ ملے گی یہاں پینے کو مئے ناب، آج
ورنہ جاتے گھر رقیب کے، سوچ ذرا
ملتی وہاں کھُل کر ہمیں سمِ شراب، آج
رخصت ہوا ہے کارواں، مڑ کر دیکھ، اے میر
دشتِ و دِمن میں دیکھینگے چمن کے خواب، آج
جا چکا ہے قافلہ، تنہا ہیں چاند ستارے
ندی ہے، زمیں ہے، نہ گلہ نہ ثواب، آج
کشتیٔ حیات بھی اب جھومتی ہے فضا میں
تسکین ہے سمندر کو، نہیں کوئی گرداب، آج
ساحلؔ، سو لینا خوابوں کی بانہوں میں
نہ دینے ہوں گے، سوالوں کے جواب، آج

مانا کہ رونق بہت ہے، رنگین ہے محفل
پھر کیوں ہے یہ دل میرا یوں سنگ دل
ولولے نہ اُٹھیں تو کیا کرے گا دل
کیا ہوگا اُس کی دھڑکن کو کہہ، ساحلؔ
وقت مہرباں ہے، اے چارہ گر سمجھ
گہرے جتنے ہوں زخم، ہو جاتے ہیں مندمل
خوابوں کی بانہوں میں اب، اے ساحلؔ
سیکھ لیا ہے میں نے بھی، رہنا خوش دل
مسائل تو بہت ہیں، کوئی حل تو بتاؤ
پیری میں جواں ہیں اب بھی، یہ کمبخت دل

کچھ غرق سا رہتا ہوں میں کچھ خالی سا رہتا ہوں میں
جیسے جام وصبو ہیں تیرے، ساقی بِن مئے، تنہا سا رہتا ہوں میں

جام محبت کے پلائے کوئی مجھے آکر سُلائے کوئی
میری نیندیں کہاں ہیں کہو یارو، خوابوں سے ملائے کوئی

بارش کی بوندیں کب گریں گی کب ہونگی میری آنکھیں نم
تڑپ زمیں کی کب مٹے گی صدا بلبل کی کب گونجے گی

سوکھے دریا میں آب کب ہوگا اندھیروں میں چراغ کب ہوگا
تشنگی بھی ظالم ہے بہت ساحلؔ، یہ دشت وصحرا، باغ کب ہوگا

کہو یہ کس شے کا بازار تھا　　کون یہاں کس سے دو چار تھا
چارہ گر دیکھا آج گھومتے ہوئے　　کہو کون سا شیخ یاں بیمار تھا
دلال دیکھے، دیکھے پرندے حسیں　　کہو کون کس کا شکارِ بازار تھا
کبھی چلتی تھی دنیا اُس راستے پر　　جو راستی کا کل راہگزار تھا
اب بھی ہے خوشبو، اے یارو، دیکھو　　کبھی اپنا بھی ایسا گلزار تھا

آج گزرتے ہوئے چند اشک گرے ساحلؔ
بتا، کیا وہ تیرا ہی اُجڑا مزار تھا

زندہ دل غمخوار اب نہیں ہیں　　آنسوؤں کے آثار اب نہیں ہیں
سرد دلوں سے اشک کیا ٹپکیں گے　　کہ گرم وہ بازار اب نہیں ہیں
سنبھل کر چلنا، اے مسافرو تم　　موجودہ راہیں ہموار نہیں ہیں
تجھے دیکھتے ہیں دیروحرم میں، ساقی　　کیا جام و صبو و میخوار نہیں ہیں
نیند نہیں آتی ہے رات بھر جنھیں　　پریشاں ہیں دوستو، بیدار نہیں ہیں

موسمِ بہار تو ہے ساحلؔ، لیکن
چمن میں اب وہ گل و خار نہیں ہیں

آئے ہیں میکدے ہم ساقی، کے سرزد ہو غم
پی لیں گے آج جو پلا، اُداس ہیں بہت ہم
گزرے گی شب تسکیں سے، فردا کے لیں گے خواب
یاد تیری بھی آئے گی دوست، جب قریب ہوگا صنم
عروج ہوا جب آفتاب، چمک اُٹھا فلک
پھر، کیا ہوا ساحلؔ بتا، کیوں یہ شامِ غم
نہ پوچھو داستاں غم کی یارو، غم ہے بُری بلا
نسخہ بتاؤ رواں رہے، جس سے رکتا ہوا دم
ہاتھ میں تیرے جام ہو، قریب ہو تیرے صنم
اور کیا رکھا ہے دنیا میں، بھول تُو جامِ جم
لکھتے رہ ساحلؔ میاں، بنا اسے شغل
چھوڑ باتیں غم کی تُو، اُٹھا لے تُو قلم
نقشِ پا بنا گئے اجداد بھی تیرے
مٹا دیا تلاطم نے ہر اُن کا قدم

داستانِ مسافرِ زیست

جس کارواں کی تلاش تھی، وہ کہکشاں میں کھو گیا
تھک کر پھر آج ساحلؔ بھی، کہیں دشت و دمن میں سو گیا

طبیعت تھی کچھ ایسی اُس کی، ہر شجر کا وہ بار تھا
مجبور کیا جب فطرت نے، وہ وہیں کا پھر ہو گیا

لے مزہ شجر کا تُو، مت بھول غافل وہ کس کا ہے
چلتے چلتے راہگزر میں، تخم کو جو بو گیا

محبت بھی کیا شے ہے یارو، زندہ کب اور کب مردہ
مانتے تھے اپنا جسے، وہ ہی دامن بھگو گیا

آگاہ نہیں خطروں سے جو، ملے گا کیا گوہر اُسے
ساحلؔ، بن پتوار کی کشتی لے کر، خود کو جو ڈبو گیا

دھواں کدھر گیا

سلگتی رہ گئی ہے نار — چین و امن تھا نام اس کا
دُخان کدھر گیا — اجداد کے زمانے میں
ماہ و انجم چھپ گیا — آج کھیت کشمیر کے لہو میں غرق
دُخان کدھر گیا — زعفران کدھر گیا

غرق ہوا سروت میں انساں — بے رحم ہے وقت ، حکمرانوں
رب کا نام ونشاں نہیں — یاد رہے تمہیں
دیکھئے محل سونے کے — وہ راجا اور وہ مہاراجا
ایماں کدھر گیا — وہ سلطان کدھر گیا

جبل پہ دیکھو کون ہے — لے گیا دُخان ساحلؔ
ہے کس کا وہ محل — اڑا کر جانے کہاں
ایماندار ہے دامنِ کوہ — سلگتی رہ گئی ہے نار
بے ایمان کدھر گیا — دھواں کدھر گیا

سنّاٹا یہ کیسا، خامشان یہ کیسا　　نیلا نہیں ہے، آسماں یہ کیسا
مل جائے مولیٰ زمیں پر کبھی　　یہ آرزو کیسی، میرا ارماں یہ کیسا
نہ نام و نشاں نہ تصویر کوئی　　خضر وہ کیسا، جاوِداں وہ کیسا
حفاظت کرے نہ عوام کی جو، شیخ　　نمائندہ وہ کیسا، سلطان وہ کیسا
کیا ہے تفریق ساحلؔ، بتا　　آج کا بشر، حیواں یہ کیسا

نہ ذہن میں سکوں، نہ دل کو تسکیں
خدایا، یہ بندہ تیرا پریشاں ہے کیسا

نہ فکر دل کی نہ جاں کی خبر　　لمحے یوں ہی گزرتے ہیں اکثر
برگ و بار کی کیا داستاں سنائیں　　روتا رہ جاتا ہے بیچارہ شجر
بدلتے ہیں لوگ نقاب، یارو　　مصنوعی چہرے آتے ہیں نظر
روتے تھے پتھر زار زار کبھی　　دل لوگوں کے آج بنے ہیں پتھر
جنت کی مجھ کو نہیں ہے خبر　　پر تیری دنیا یارب ہے زیر و زبر
ذات خدا کی، پہچان ساحلؔ　　اُس سے نہیں ہے کوئی ذات برتر

جی چاہتا ہے آ کر تجھ سے ملوں
مولیٰ، کہاں سے لاؤں میں بال و پر

مشتاق سے کھلتے ہیں گل چمن کے
اُن کی نظروں سے بدلتے ہیں رنگ سمن کے
دل خوش ہو یارو تو مہکتے ہیں گل
مشک بار ہو جاتے ہیں تار من کے
اب تو آؤ، اے خوابو، منتظر ہے شب
نغمے سناؤ، تم مشکِ ختن کے
جو سمجھتا ہے ماہیت خاکِ وطن کی
وہ ہی گاتا ہے گیت، حبِّ وطن کے
ابھی زندہ ہیں یارو بات زیست کی کرو
سُن لیں گے قصّے بھی کفن دفن کے
بات کرو ایماں کی، مہرِ خدا کی
کُہن ہیں بہت، قصّے دولت ودھن کے
یقیں لے کر جالبِ دریا، اے ساحلؔ
پھر دیکھ معجزہ تُو، گنگ وجمن کے

خانہ بدوش ہیں سب اے کاروانِ میر
نہ کسی کے پاؤں میں بیڑیاں نہ کوئی زنجیر
یہ آوارگی ہے کیسی کوئی تو سمجھاؤ
کیا سو گیا ہے آدم کا، بیدار ضمیر
نہ دیر و حرم میں، نہ خمگاہ میں چین
نہ واعظ کی ضرورت، نہ آستانِ پیر
مضطر ہے کتنا، یارو شیشہ لے آؤ
کوئی تو دکھاؤ بشر کو تصویر
نہ اخوت کوئی، نہ ہمدردی کہیں
یارب، کیا انساں بنا ہے ابلیس کا صفیر
ظالم یہ کتنا دولت کا نشہ
آج عبادت کرتے ہیں،صرف پیروفقیر

کیا بن کر رہ گئی ہے یہ اجارداری فقیروں کی
کیوں دل چسپی نہیں ہے الفت میں آج امیروں کی
جام محبت کے چھلکتے تھے میخانے میں کبھی
ساقی، بولی لگتی ہے اب رندوں میں جاگیروں کی
کبھی فراست مندوں میں ہوتی تھی بحث ادب کی
آج ذکر ِگلوں کا، اور ہوتی ہیں باتیں ذخیروں کی
تیرا رعب و داب یہاں کس کام، اے شیخ
یہ تو محفل ہے غریبوں اور چند دبیروں کی
یارو، وہ بھی کیا زمانہ تھا، ہر سُو تھا قہقہہ
آج جستجو ہے اس زمانے کی تصویروں کی
اے نوجوانوں، اے غربت کے مہمانوں، سوچو
آب و گل کو ضرورت ہے آج اپنے اسیروں کی
کسے کیا ملے گا جہاں میں کب، کون جانے
ساحلؔ، کھیل ہے یہ لکیروں کا، بات تقدیروں کی

کرن حافظے میں جاگی، طفلی کی جب جناب
لے گیا تصور پھر، لبِ چیناب پر آج
کیا رکھا ہے میکدے میں، تُو ہی بتا واعظ
کیوں جاتے گر اعتبار ہوتا، جناب پر آج
صبح و شام کا شمار، گنتا کیا ہے بندے
منحصر نہیں ہیں لمحے تیرے، ان کے حساب پر آج
چل دیر و حرم کو آزمالے، اے مومن ساحلؔ
اُٹھتا جا رہا ہے بھروسہ، ساقی کی شراب پر آج
سوچو، اے حکمرانوں، بہہ جاؤ گے ورنہ تم
ساحل پہ نہیں کھڑے ہو، ہو لبِ گرداب پر آج

ساحلؔ، منزل ملے گی تیری دعا کو پر ، تجھ میں جنونِ پرواز تو ہو
سُنے گا مولیٰ ہر آہ تیری پر زبورِ جبیںِ نیاز تو ہو
تمنّا، خواہش، آرزو، حسرت ثواب حق ہے،راست نماز تو ہو
آئیں گے دیر و حرم بھی، واعظ کاش، میری عمر دراز تو ہو
محفل میں ساقی ہنگامہ بہت ہے میکدے میں پینے کا انداز تو ہو
پڑھیں گے غزل، یارو ہم ضرور
لیکن، ساحلؔ کوئی نغمہ پرواز تو ہو

ٹھہر جا اے آفتاب، حسیں ہے تیرا نقاب
سو رہی ہے شب ابھی، ہے دل میرا بیتاب
حساب نہ کر شب و روز کا، یوں ہی رہنے دے
جینے دے زیست مجھے، آہستہ، بے حساب
کل تک جو اٹھے تھے طوفاں، تھے وہ کہیں دور
چلے آئے ہیں در پہ کیوں، بن کر اب گرداب
دل میں گر سوز نہیں، تو کیا کرے ستار
رہ جائے گا، پھر موسیقار، ہاتھ میں تیرے مضراب
انتخاب نہ کر چمن میں، پھول، پھول ہیں ساحلؔ
گل کھلتے ہیں دل میں جب، کھلتا ہے گلاب
مانا پھول پھول ہے، بجا فرمایا جناب، لیکن
صاحبِ ادراک کرتا ہے بصیرت سے، انتخاب

ساحلؔ، سکوں بھی ایک پرندہ ہے، ضرور
آج اس شاخ پر، کل جانے کس شجر پر
آئیں ہیں تیرے در پہ، سرور کی ہمیں تلاش
ساقی، چھوڑ آئے ہیں سکوں کو ہم، آج گھر پر
یہ چمن ہے یا بیاباں، مت پوچھ مجھے جانم
دارو مدار اس کا ہے ، تیری نظر پر
چلتے رہ اے راہی تُو ، فکر ماضی کی کیوں
نقشِ پا رہیں نہ رہیں، تیرے راہگزر پر
قہر دیکھ اے مصنف، نظروں میں اُن کی ذرا
الزام نہ لگا قتل کا، بے زباں خنجر پر
میکدہ ، دیر و حرم ، دشت و صحرا سب
لیکن، دم ٹوٹے گا ساحلؔ کا، رب کے در پر

نہ ثروت نہ شہرت نہ دیگر جنوں
تمنائے دل ہے مکمل سکوں
نیندخوابوں میں گزرے، آفتاب ساتھ اٹھوں
صدا کوئل کی میں، صبح ہی سنوں
مئے ناب تو ملے گی ساتھ حور کے کبھی
تیرے جام سے ساقی ایک گھونٹ پی لوں
نہ مندر نہ مسجد نہ کلیسا کوئی
باطن میں خدا ہے، جنت ہے دروں
مولیٰ ہے باسط ، کیا دے گا شیخ تُو
نماز میں کچھ نہ مانگا، تجھ سے کیا مانگوں
رکھنا خوش خود کو ذمہ میرا ہی ہے
قصد کرتا ہوں ساحلؔ ، کے خوش رہ سکوں

تصور ہے تیرا دل میں خدا یا
جی کرتا ہے بہت تجھے دیکھ لوں

نغمۂ موج

چلی آتی ہوں ملنے، میں ساحل تجھے
سمندر سے ہو کر، پریشاں

موج ہوں میں، مدّ و جزر میرا نصیب
سکوں ملتا ہے تیرے، یہاں

تکتی ہوں میں، تجھے تڑپتے ہوئے
گرمئی خورشید میں دوست

سلگتے ہوئے تیری ریت سے
جب اٹھتا ہے خام سا، دھواں

آتی ہوں پھر تشنگی میں مٹانے
نظر آتا ہے تُو جب، بے آب

بے رحم یقیناً، تپش ہے اس کی
جسے کہتے ہیں لوگ، آفتاب

مشکل ہے بہت تجھے چھوڑ کر جانا
منّتیں نہ کر تُو میری

نہیں ہے کوئی ٹھکانہ میرا
میری فطرت ہے، خانہ بدوشی

تُو ہی سمجھا، اے ساحلؔ اسے
بات مان لے یہ شاید تیری

بیتاب ہے موج، مثلِ ہوا
اے ساحل، وصال ہے دل لگی

کر لیں گے توبہ توبہ، ساحلؔ
ہو تو جائے زخم، مندمل
سوکھ تو لے یہ جام مئے کا
رو تو لے یہ پتھر دل

آئے ہیں محفل میں تیری
کر لیں گے توبہ ہم جانم
نام ساحلؔ کا پکارو
محبت کی ہے صنم

ڈھونڈتا ہے کیا ساحلؔ بتا
منزل تیری ہے کیا
در بدر گھومتا ہے کیوں
معبد سے تُو میکدہ

آج کے ماحول پر تبصرہ
خدا نہ کرے ہو ایسا
ماحول ایسا ہے جہاں میں ساحلؔ
ایماں کا ہوا ہے ریشہ

سفر میں ساحلؔ آج نزاکت یہ کیسی
زہر کی ندیوں میں حلاوت یہ کیسی
کبھی الفت کے سُنتے تھے نغمے یہاں
آج دلوں میں ہر سُو، عداوت یہ کیسی
جیسی کرے گا ویسی بھرے گا، پھر
دوستو تقدیر کیا ہے، کہاوت یہ کیسی
لئے پھرتے ہیں لوگ دلوں میں خنجر
زباں شیریں، پھر صداقت یہ کیسی
سجدہ کوئی نہ لب پے نام رب کا
تُو ہی بتا ساحلؔ، عبادت یہ کیسی
آج خودکومولیٰ سمجھتا ہے،انساں
یارو،تم ہی بتاؤ بغاوت یہ کیسی

نشہ تیرا ساقی انجام صحبت کا
بھٹک جاتا ہے انساں قصور حسرت کا
نکلے تھے گھر سے منزل تھی معبد
چلے آئے میخانے، حکم قسمت کا
چمن میں پھولوں کی بہار ہے آج
اُداس گلاب، اثر خار کی صحبت کا
مانا ہے خدا پر خدا تُو نہیں ہے
جانم، غلطی میری، قصور الفت کا
جہنّم تو حاصل ہوگی ہی، یہ مسئلہ نہیں
دور کتنا ہے فردوس سوال جنت کا
دیوانہ تھا مجنوں، کیوں گھائل ہے ساحلؔ
خدا سے ہے الفت، قصور عبادت کا

تمنّا، حسرت، خواہش، ساحل　　کبھی میکدہ، کبھی کعبہ منزل
خدا جانے کسے کب اور کہاں　　ہوگی حسرتوں سے راحت حاصل
تیرا کیا ٹھکانہ زندگی بتا　　ہمراہی ہر گام ہے قضا مستقل
حال ہی میں جیتا ہوں یارو ہمیشہ　　کون جانے کیا بلا ہے مستقبل

ساحلؔ، موت ایک حادثہ ہے، بس
ہم تو زندہ رکھتے ہیں، یہ دل مستقل

کی اہلِ چمن سے دوستی جب ساحلؔ
بھولے خمگاہ کو، ملی جب منزل
خار ہیں بہتر اے اُجڑے ہوئے گلشن
مُرجھائے پھولوں کی کیسی ہے محفل
جس تیرِ نظر سے اُٹھتی ہے محبت
اُسی تیرِ نظر سے دل ہوتا ہے گھائل
سمندر کی موج سے پُرسش یہ کیسی
کیوں آئی ہے ملنے، تجھے وہ ساحل
عجب ہے یہ کتنی دنیا تیری مولیٰ
سمندر ہے ذریعہ اور کبھی وہ حائل
ساحلؔ ، نہ کی فکر نہ پروا کبھی
ہوں گے یا نہ ہوں گے یہ زخم مندمل

ہم بھول چکے ہیں ساحلؔ اُس راہگزار کو
پر چومتی ہے اب بھی صبا اُس گل و خار کو

کب تک رہے گی حاوی، تجھ پر خزاں، بتا
بلا لے اے چمن تُو، اب روٹھی بہار کو

در بدر میخانے کی ہے کیوں تجھے تلاش
اے مجنوں، مان لے محفل تُو اُجڑے دیار کو

عیش و عشرت کا بھی اٹھتا ہے دھواں کبھی
ہوا مت دینا یارو تم بھڑکتی نار کو

لے ڈوبے گی بے زنجیر انا بحر میں ضرور
بُری بلا ہے انا دوستو، مت پالو آستین کے مار کو

ملے گا کاندھا مزار تک، اے شیخ تجھے
کیا سجاتا ہے تُو اس مشتِ غبار کو

زمیں پر ستارے بہت ہیں، سوچو ذرا لوگو
لے جاتا ہے طوفاں ہر ہوا سوار کو

لکھتے جا ساحلؔ، پڑھتا رہ کلام تُو
اجل کے بعد ہی ملتی ہے پسندیدگی، اشعار کو

کیوں رو رہا ہے ساحلؔ، گِلہ نصیب سے ہے کیا
تیری فغاں سے کچھ ظاہر ہے، عندلیب بن کر سُنا

نہیں ہوں تیرا دشمن میں، یار ہوں تیرا
رکھوں گا راز دل میں دوست، تُو حبیب بن کر بتا

خونِ جگر سے لکھتا ہوں، جو آئے دل میں یارو
کس نے مجھے خواہمخواہ، یوں ادیب کہا

دل صاف ہے منصف، میں ثبوت کیا دوں تجھے
صحائف کی قسم کھائی ہے، بیشک سلیب پے چڑھا

مومن ہے تُو ساحلؔ یہ تو سب نے مانا
اور کون ہے یہاں تیرے قریب، ہمیں بھی تو بتا

دوستی ہے نام حیات کا، مستقل رفاقت
دعا کرتا ہوں میں ساحلؔ، خدا رقیب کا کرے بھلا

کبھی ہم بھی میرِ کاروان تھے　　ساحل، زمیں و آسماں تھے
پیری نہ تھی قریب کہیں　　کبھی ہم بھی دل جواں تھے
کبھی ہم بھی میرِ کارواں تھے

کبھی ہم بھی حسیں داستاں تھے　　آہ تھے، اور سرد فغاں تھے
کاسہ بہ دست یار پر　　کبھی ہم بھی مہرباں تھے
کبھی ہم بھی میرِ کارواں تھے

کبھی ہم بھی کسی کی جاں تھے　　عبادت کی آستاں تھے
خانہ بدوش کی ہم بھی، یارو　　ہر حال آشیاں تھے
کبھی ہم بھی میرِ کارواں تھے

مایوسی کی مسکاں تھے　　نفرتوں کا نقصان تھے
لڑتے تھے ہم شیخ سے　　غریبوں کی ہم زباں تھے
کبھی ہم بھی میرِ کارواں تھے

کیا کہنے ہیں رنگ تیرے　　کیا کہنے ہیں ڈھنگ تیرے
تو بدلتا ہے وقت کیسا　　ہم تو چلتے ہیں سنگ تیرے
کبھی ہم بھی میرِ کارواں تھے

مرہم کی ہم دکان تھے　　دلوں کے بھی ارماں تھ
خرید وفروخت کی بات نہ تھی　　پُرسکوں دل اور لوگ انساں تھے
کبھی ہم بھی میرِ کارواں تھے

زندہ رہ کر بھی جستجو رہی زندگانی کی
گفتگو ہوتی رہی ہے زیست، تیری روانی کی
بھول رہا ہے ساحلؔ مفہوم تُو حیات کا
فکر کیوں طربت پر تجھے گلفشانی کی
پتھر کا وزن لئے، دل گھومتا ہے کیوں
اُتار کفن مسافر، یاد دِلا جوانی کی
ساقی، رند تیرے چور ہیں مئے کی مایوسی میں
فجر کا سوچ، کر باتیں اُن سے شادمانی کی
اے فاسق جل جائے گا شرارِ گنہگاری میں
عرقِ انفیعال کی سوچ، فکر شرمندگی کی
نشہ کیسا ہے آج اہلِ سیاسی کا آج
منتظر اکثیر کے، تشنگی نہیں پانی کی

تشنگی سے پوچھ ساحلؔ، سرور کیا ہے آب میں

راز کتنے پنہاں ہیں، بے بس دلِ بیتاب میں

شمار کیوں گناہوں کا، اے واعظ تُو ہی بتا

کوتاہی ہے، اے بےخبر، تیرے آج حساب میں

تباہی تیرا شوق ہے، ذوق بھی شاید خزاں

خوشبو کیسی، پھر بتا، چمن کے آج گلاب میں

آئے ہیں خمگاہ ہم ساقی، پِلا اب نظروں سے تُو

خالی ہیں جب جام تیرے، نشہ کیا ہے شراب میں

خواب دیکھے دن میں ہم نے، رات کو خفتہ بھی

فرق کیا ہے بولو یارو، حقیقت اور سراب میں

انجام کیا ہوگا، کہو ناداں اِس انساں کا

شناخت کرنی جو بھولا ہے، عدو اور ارباب میں

بدلا ہے زمانہ کیسا، یقیں دل میں ہے نہیں

صداقت تیرے، اے واعظ، نہیں ہے خطاب میں

ساحلؔ، مابعد تیرے دل میں ہے، کرلے تُو طواف

کب ملا سکوں کسی کو، مجازی اسباب میں

تمنّا، آرزو، خواہش سے، کب ملی تسکین کسی کو
مل کر خاک میں بھی ساحلؔ ، کب ملی زمین کسی کو
کھیل ہے یہ مقدر کا، چاہت سے پھر واسطہ کیا
کب ملی چاہنے سے، زیست کبھی حسیں کسی کو
ہنگامہ ہو رہا ہے یارو، مذہب کے آج نام پر
سیاسی ہے یہ معاملہ کیوں بہکائے دین کسی کو
ملتا ہے سکوں سب ہی کو، جبینِ نیاز میں
نہیں دیتی ہے تسکین، مغرور جبیں کسی کو
مسخری ہے دنیا ساحلؔ ، ہر شخص یہاں نقّال ہے
سلطان کے لباس میں بھی، کب ملی تمکین کیسی کو
تنگ دل ہے جہاں کیوں، بتا اے رب مجھے
دشوار کیوں ہوتا ہے کہنا ، آفرین کسی کو

کب چلے گا قافلہ، کتنی اور تاخیر ہے
ہم تو ٹھہرے مسافر، رب کارواں کا میر ہے
خوشی اور غمی بھی، جو بھی ہے سو یہیں ہے
تُو ہی بتا رب میرے، پھر جنت کیوں بے نظیر ہے
کیا لباس پہناتے ہو، سجاتے ہو تم کسے
اُڑ جائے گا فضا میں، جسم تو خاک و خمیر ہے
چھوڑ امید جاوِدانی کی، وہ تو ایک سراب ہے
عرق ٹپکے جبیں سے، وہی حیات کی اکثیر ہے
داستاں بن کر رہ جاتی ہیں، یادیں بس ماضی کی
مٹّی کے پتلے ہیں سب، نہ کوئی رانجھا نہ ہیر ہے
سُن میری نہ غور کر، کر جو دل میں آئے
اے مسافر، سن باطن کی، جہاں تیرا ضمیر ہے
تفریق، شغل انسانوں کا، ورنہ سب تو ایک ہیں
پوچھ خدا سے، یار تُو، کون صغیر کون کبیر ہے
یارو، قتل کرنے جاتے ہو ہاتھ میں لئے تیغ
یہ تو سوچو ہاتھ میں اُس کے، قسمت کی لکیر ہے
کاسہ لے کر پھروگے، نام رب کا بھی لو گے
جو دل سے مانگتا ہے دعا، وہی اصل فقیر ہے
دعا کرتے جاتُو ساحلؔ، کھلی ہوا میں موج کر
زمیں پر ہیں چند بیڑیاں، زندگی زنجیر ہے

کیا کبھی اس چمن میں بہار تھی　　باغباں اور بلبل میں گفتار تھی
رنگ گلوں کے تھے آتش فشاں　　کیا گلستاں میں بھڑکتی نار تھی
خزاں نے کیا برباد مستقل　　کیا گلوں کی کبھی یاں سرکار تھی
آج بکھرے ہوئے ہیں کھنڈر ہر جا　　کیا پھولوں کی کبھی یہاں دیوار تھی
اے بادِ نسیم تُو کیوں نہ آئی　　تُجھے آنے میں کیا کوئی عار تھی
آمد و رفت اُن کی تو فطرتاً تھی　　بہار و خزاں میں کیا تکرار تھی

گر قسمت نے لکھا تھا بیاباں، ساحلؔ
کیا بے بس خزاں گنہگار تھی

حسبِ حال انساں

پانی کا بلبلا اور مشتِ غبار ہے — خدایا، یہ انساں تیرا بے اعتبار ہے
بھولا ہے تجھے، احسان فراموش ہے — ہنگمہ بپا ہے، یہ خود ذمہ دار ہے
مرہم لئے پھرتا ہے چارہ گر تُو کیوں — اس کے سینے سے تیر تو آر پار ہوتا ہے
اتنا دور جا چکا ہے صداقت سے یہ — اب تو چہروں پر لکھا ہے، ''مکّار ہے''
خودغرض ہے اتنا تیرا انساں، یارب — نہ اپنا نہ کسی کا یہ یار ہے
ساحلؔ، کیوں جاتا ہے یہ مابعد بتا — یارو، پشیماں بشر ہے، گنہگار ہے

بھیج پیغمبر تُو دنیا میں، مولیٰ
ہر حال، اُسی کی جہاں کو درکار ہے

رات کے گزرنے پر ختم ہو جاتی ہے بات
شبِ ہجر کی بھی ہوتی ہے آفتاب سے ملاقات

ساحلؔ، کیا ہوا، کیوں ہوا، ان بن یہ کیسی
لوگو، مت کرو مجھ سے یہ فضول سوالات

شادمانی کے چہرے پہ قوسِ قضا، پھر
کیوں ہوتی ہے آنکھوں کی شب بھر برسات

کسے حاصل ہوئی فتح قسمت پر کہو
کرنی پڑتی ہے صلح، ہوں جو بھی حالات

اے احسان فراموش، رب کی ہے کائنات
کیا دے گا تُو انساں کسی کو سوغات

سر جھکا کر چل اور تقدیر کر تسلیم
یہ درس ملا ہے ساحلؔ کو، وقت سے حضرات

محبت بھی ساحلؔ غضب کی دوا ہے
بلبل کی جیسے چمن میں نوا ہے

اندھیروں میں جیسے جلتا دِیا ہے
فضاؤں میں مانو بہشت کی ہوا ہے

لب پر نام رب کا دوغلی زباں ہے
جو دل سے بس نکلے وہی دعا ہے

خدا ہی خدا ہیں جہاں میں آج یارو
خدا کی کہو کسے واقعی پروا ہے

ہم تو مانتے ہیں ساحلؔ تجھ ہی کو دوست
بیاباں کا راستہ ہی تیرے سوا ہے

تُو کچھ بھی نہیں ہے اے شاعر سمجھ
مقابلے میں اُس کے جو دل میں بسا ہے

ہم وہ زندہ دل ہیں ساحلؔ دیکھی ہے جس نے، ہر مشکل
ذمّہ لیا حال کا خود پر خدا پر چھوڑا، مستقبل
بے ہوش ہیں بادہ خوار، ساقی کیا زندہ دل ہے یہ محفل
زیست کا نام دولت نہیں ہے اس پیش رفت کا کون ہے قائل
آساں نہیں ہے جینا، یارو ہموار راہ میں دیکھو، ہائل

آتے ہیں لمحے وہ بھی ساحلؔ
زیست اور کبھی موت کے مائل

گلے ہم سے جب کھیل ہے ستاروں کا
خزاں کے ہوتے کیا پتا بہاروں کا
تلاش منزل کی ہے مسافر تجھے
اور، بھروسہ ان عارضی راہگزاروں کا
نہ بنا سکا گھر کو پُر سکوں، اپنا
تو قصور کیا، خموش دیواروں کا
پُرسش چارہ گر سے، مرضِ دل کی کیسی
قاضی کیا جانے، حال دل کے بیماروں کا
بھولے ہیں رب کو یہ مذہب کے پاسباں
روّیہ دیکھئے آج کے دینداروں کا
کبھی سوچتا ہوں میں، اے ساحلؔ میاں
کیا خدا الگ ہے قسمت کے ماروں کا

ذرّہِ شکستِ خاک کو رکھ تُو سنبھال کر
دل سے اپنے پھر تُو ساحلؔ چند سوال کر
کیا ہوا گر ہارہ تُو زیست کی نبرد میں
کب دی شکست موت کو، کسی نے، خیال کر
میلانِ طبع کیوں، خود کو مٹانے میں
ہوش کر اے بشر، جہاں کو مت پایمال کر
بُری بلا ہے عیش وعشرت، یاد رہے ساحلؔ
رکھ کر نام رب کا لب پر، زوال کو محال کر
ذہن وضمیر ہے، نیک دیا ہے دل خدا نے
عقل وفراست کا مکمل، ہمیشہ استعمال کر

ساحلؔ اپنوں کو جا کر اپنا لیجئے روٹھوں کو جا کر منا لیجئے
مئے ناب ہے زاہد اب پی لیجئے شراب ہو تو بے شک جدا کیجئے
دل تو سب ہی کے ہوتے ہیں پاک گنہگاروں کی صدا بھی سنا کیجئے
وزن اشکوں کا کب تک اُٹھائے چلے گا تنہائی میں راہی بہا لیجئے
منجدھار میں ہو کشتی تو لازم ہے خوف لبِ ساحل ہو گرداب تو کیا کیجئے
فطرتاً سو جاتا ہے ضمیر بھی کبھی خفتہ ضمیر کو آپ جگا لیجئے

فکر کرتا ہے سب کی تُو ساحلؔ میاں
د ل ا پنے کو بھی تو ہنسا لیجئے

تُو کہے تو فلک سے ستارہ لے آؤں　　تلاطم سے جاناں کنارا لے آؤں
آسمان سے کوثر، قوسِ قضا کے رنگ　　میں وجودِ الفت کا استیارا لے آؤں
حکم ہو تیرا تو ہر حال جانم　　حُسن سے چھین، آتش پارہ لے آؤں
ایک اشارہ تو دے، نگاہوں سے ہی　　جنت سے زمین پر نظارہ لے آؤں
بال و پر نہیں ہیں، پرواز ہے مشکل　　تُو چاہے تو اُڑتا غبارہ لے آؤں

گر تُو کہے ساحلؔ تو بات ہی کیا ہے
منا کر قضا کو، زیست دوبارہ لے آؤں

کمالِ ضبطِ سخن تو دیکھ لوں — خموش اشکوں کا فن تو دیکھ لوں
تصوّر کے ہُنر کو آزما لوں آج — خوابوں میں گھر کا آنگن تو دیکھ لوں
پرکھا ہے انساں کو، عمر بھر ہم نے — کچھ وقت پیچ و خمِ زمن تو دیکھ لوں
مثلِ خزاں پیری یاد آتا ہے شباب — کاش، ایک اور موسمِ ساون تو دیکھ لوں
جاتی بہار سے اب التجا، ہے ساحلؔ — ٹھہر، ایک نظر اور ثمن تو دیکھ لوں

دیکھیں ہیں پھول بیاباں میں حسین
اے شیخ، تیرے کاخ کا چمن تو دیکھ لوں

بِن صداقت داستاں کیا رُلائے گی
چرب زباں کسی کو کیا سمجھائے گی
دیکھا ہو جس نے قہر قسمت کا ساحلؔ
سُلگتی ہوئی نار اسے کیا جلائے گی
سورداس بن کر گر چلو گے
کور چشم کو روشنی، راہ کیا دکھلائے گی
نہ جاؤ گے اگر گلستاں تم کبھی
عندلیب نغمہ، تمہیں کیا سُنائے گی
آگاہ کرتی ہے قضا، وہ انجام ہے
کھُل کر جی، ساحلؔ، وہ اور کیا بتائے گی

ڈھونڈتے رہے خزاں میں، دامن بہار کا
دِکھایا پھر باغباں نے، رُخسار گنہگار کا
شرم سار خزاں نے، مُنہ پھیر لیا پھر اپنا
رُخصت ہوئی لے کر وہ، سہارا خار کا
آزمائشِ ہمّت میدانِ جنگ میں کرو
سلاخوں کے پیچھے بند شیر، کیا جانے شکار کا
گھر بنایا تم نے جب تنکوں سے اے پرندو
ہم کرتے ہیں کیوں بھروسہ بوسیدہ دیوار کا
غرور کس بات کا ، ظالم ہے یہ دنیا شیخ
مرض تیرے باطن میں ہے، مت پوچھ حال بیمار کا
تماشہ گاہ ہے زندگی، تماشائی یہ بشر
آتا ہے طوفاں کبھی، پھر جھونکا بہار کا
پرواز کیا شباب نے، ستاروں سے کھیلنے
کیا پوچھتے ہو ماضی کا تم، الفت کے روزگار کا
خطبہ نہیں ہے کارتیرا، فراست مت جتا
واعظ نہیں ہے ساحلؔ، تُو نبھا کردار فنکار کا

''ڈوب جاتے ہیں اُمیدوں کے سفینے اُس میں
میں نہ مانوں گا کہ آنسو ہے ذرا سا پانی''

لوگ کہتے ہیں تجھ کو فراست مند، ناصح
ہم سمجھاتے ہیں ساری دنیا ہے، دیوانی

واعظ، جب پتّا بھی نہیں ہلتا ہے بن مولیٰ کی رضا
پھر کیا ہے وہ حادثہ جسے کہتے ہیں ناگہانی

کیوں اُٹھتے ہیں من میں یہ سوال تیرے ساحلؔ
خدا ایک ہے اور وہ ہے منفرد، لاثانی

جیسی بھی گزری ہو زندگی، دوستو
بے مثال ہے، حسین ہے یہ زندگانی

جل جائے بے شک، یہ خاکِ بدن میرا
نہ جلے خدایا، یہ نشیمن میرا
دعا کرتا ہوں تجھ سے، اے مولیٰ، ہر روز
رہے زندہ ہمیشہ یہ انجمن میرا
پھول کھلتے رہیں ہو چہروں پے تبسم
ہرا بھرا آباد رہے یہ آنگن میرا
گلشن میں، اے مالی، ہزاروں ہیں گُل
میرے چمن میں کھلتا ہے یہ ثمن میرا
اب چاہت ہے بس اتنی سی، ساحلؔ
اُسی ثمن سے بنے، کفن میرا

بات کرتے ہو خوابوں کی، جو فقط نظارے ہیں
اُڑتے اُڑتے خواب بھی ساحلؔ، مثلِ غبارے ہیں

ضبطِ غم، ضبطِ آنسو، یہ تو اشارے ہیں
کہ روشن ہے ذہن اور یہ اُس کے ستارے ہیں

سجدہ، جبینِ نیاز، نام رب کا لب پر
اے بندے، ہر حال میں یہ اصل سہارے ہیں

یارو، گلشن میں جاتے ہو نَو بہار دیکھنے
بیاباں میں بھی گُل ہیں، قسمت کے مارے ہیں

ہر پھول میں ہو خوشبو یہ ضروری تو نہیں
حسین گُل بھی کبھی، بنتے انگارے ہیں

خود ہی سے نہ ہوئی جب شناسائی کوئی
ساحلؔ، پھر کسے کہیں ہم، کہ وہ ہمارے ہیں

یہ فضائے خموش کیوں، اے ساحلؔ بتا
شبِ ہجر دور ہے کیا ہوگا حال دل کا
کیا نہ ہوگا میرے آفتاب کا عروج کل
جاری رہے گے ماہ و انجم کی محفل، کیا
کیا نہ سوئیں گے ستارے کل صبح کو، بتا
کیا بے کراں ہوگی رات کیا ہوگا نم دل کا
اُٹھالیں گے تیری آشفتگی کا وزن، اے دل
یاد رہے بھار زیادہ نہ ہو محمل کا
واعظ کو نہ بُلا، مئے ناب نہ پلا
سوچ ساقی، کیا ہوگا رند کی محفل کا
ہجر تو ہوگا کب ہوگا وصال، اے نجومی
کیا خبر ساحلؔ، کون جانے حال اس دل کا

داستان نہ سناؤ تم وارداتِ قلب سناؤ
کہانیاں تم بیٹھے بیٹھے یوں نہ بناؤ
رفیقِ زندگی تو سب ہی ہیں، ساحلؔ میاں
تم کبھی انیسِ اجل بن کر دکھاؤ
حیاتِ عشق تو جاگیر ہے نوجوانوں کی
سناؤ تو بات رمزیّت کی سناؤ
ستاروں سے گفتگو ہے گر بلندیٔ نظر
یوں بیٹھ کر ہم سے پھر باتیں نہ بناؤ
ساحلؔ، پرواز کر، مل خدائے دوجہاں سے
کیا خبر کوئی فرشتہ کہے، آؤ، آ جاؤ

جو دے سکتا ہے ساحلؔ، کُھل کر دے
فانی ہے جہاں، کیوں کرنے گِلے شگوے
مثلِ رنگ، بے ثبات ہوتے ہیں یہ
یارو، نازک ہوتے ہیں بہت باہمی رشتے
اے نوجوانوں، تہذیب کو نہ بھولنا
سیکھ لو کرنا، آداب و نمستے
بھیجے تھے خدا نے زمیں پر پیغمبر
پر، روز تو نہ آئیں گے یہاں فرشتے
نہ پائیدار ہے کتنا یہ انساں دیکھو
پھسلتی زباں، اور پاؤں ہیں کھسکتے
کیا شیطان بستے ہیں دل میں اس کے
مولیٰ، اب تُو ہی بتا اسے حق کے رستے
تُو بھی کہہ دے ساحلؔ جستجو تھی خدا کی
اور گزری ہے زندگی، ترستے ترستے

کس پر کب آ جائے یہ آوارہ جاں
لا محدود ہے یہ دل، اے بحرِ بیکراں
رنگ و بو نکلی، چتون آج منافق
محبت کرنے والے ملتے ہیں کہاں
ساحلؔ، سراب ہے یا ہے یہ اصلیتِ بیاں
اے فلک، نشیمن کس کا ہے وہ ساتواں آسماں
ہم آہنگی میں بھی دراریں آتی ہیں
اے زیست، تجھ پر جاں ہے قرباں
امتحاں ہے ساحلؔ ہر لمحۂ حیات
کس نے کہا کہ یہاں جینا ہے آساں
آؤ بہارو ، منائیں جشن چمن میں آج
الوداع کہہ گئی ہے بے رحم خزاں
قارون کی دولت میں نہیں ہے اطمینان
کیا کریں گے پا کر ہم بحرِ بیکراں
مت کر کوئی سوال وسعتِ بیتابی کے
خانہ بدوش ہے دنیا، اے میرِ کارواں

اب اور کیا کسی سے مراسم بڑھایں ہم
جب دل میں سکوں ہے، ہیں بے نیازِ غم

دوا نہ دعا، نہ ہی چارہ گر کا فیصلہ
ہمدردی سے بڑھ کیا ہے کوئی مرہم

ذرا سی صبا الجھا دیتی ہے ہمیں
تمہیں راز کیا بتائیں، نازک ہو صنم

بے سُری ہے بلبل، غم اُسے کیا اب
کیوں منا رہے ہیں چمن میں، گُل ماتم

یقین ہے اساس، اے سُخن سنج ساحلؔ
وہ بھولا ہے رب کو جس کا شوق ہے وہم

خطا ہوئی ہے ساحلؔ سے یہ مانا ضرور
کوئی وجہ بھی تو پوچھو کیوں تھا وہ مجبور
مغفرت تو ہوگی روزِ محشر، منصف
دار پر مت چڑھا جب خطا ہے منظور
انکساری ہے طبع یہ جانتے ہو تم
نہیں شامل ہے ساحلؔ میں، ایک ذرّۂ غرور
سیدھا سادہ ہے وہ انساں یہ مانتے ہیں سب
بات کیجئے آپ اپنی، شیخ صاحب ضرور
سنجیدہ ہوتا ہوں میں سُن کر خطبے تیرے
کیا جانے تُو واعظ، مئے ناب کا سُرور
چلو عبور کریں یارو شاید اُس پار ملے حور
فردوس کس نے دیکھا، جنّت ہے بہت دور
تجلّی ملے یا رب، تو نشیمن میں میرے
نہیں جانا ہے مجھے سیرِ کوہِ طور
بیاباں ہو یا دشت وصحرا، یا در ہے ساحلؔ
وہ ظلمت سے نہیں ڈرتا جس کے دل میں، نور

نگاہِ مردِ مومن روک دیتی ہے طوفاں کو
فغاں تیری ساحلؔ چیر دیتی ہے آسماں کو
تیرے ظلم کی چرچا شہر میں پھیلی ہے ایسے
سُنتے ہیں شیخ، شرم آتی ہے زنداں کو
انساں انساں میں فرق، کیا ہے بتاؤ
طبقے کا نہ ہو، عزت پھر بھی دو مہماں کو
سناؤ کہانی تو کہانی ہی سناؤ
کبھی تماشا نہ بناؤ داستاں کو
ظالم ہے دنیا فانی ہوتے ہوئے
سنبھال کر رکھو لوگو، اپنے داماں کو
جیسے رکھتے ہیں شمشیر کو میان میں
سنبھالے رکھ، اے ساحلؔ، تُو اپنی زباں کو

کیا عبادت ساحلؔ عشقِ بتاں ہے ورنہ، ایماں کیا ایک کھُلا آسماں ہے
سودا ایماں کا، سودا جہاں کا تُو ہی بتا مولیٰ یہ کیسی دُکاں ہے
کیا ہوا ہے کہو، باہمی رشتوں کو، آج جب مُروّت ہی خود، روحِ رواں ہے
عند لیب ، گلستا ں ، نشیمن میر ا جاناں، تُو ہی بتا کہاں تیری جاں ہے
کیا کریں ہم بھروسہ کسی پر کوئی جب محبت بھی یارو، بد گماں ہے
جدھر دیکھئے ایک ہنگامہ بپا ہے کیا ہوا ہے جہاں کو، یہ کیسا انساں ہے
بھُولا ہے رب کو تُو کیوں، اے مسافر نہ مکاں ہے تیرا، نہ اب لا مکاں ہے
جینے کے سہارے بہت ہیں، دوستو غم ہے، درد ہے، یادِ رفتگان ہے

کچھ پڑھ کلام ایسا کہ مانیں تجھے شاعر
ردیف قافیہ ملانا، تو ساحلؔ آساں ہے

منتظر ہے دھویں کا آسماں آسماں
پرواز کرتا ہے دیکھو دھواں دھواں

روک سکتے ہو شیخ تو روک کر دیکھ لو
دریا کا بہنا ہے رواں رواں

محبت کی ہم نے کی عزت مکمل
راز دل میں رہا نہاں نہاں

مت بہاؤ انہیں دریا کی مانند
اشک ہوتے ہیں یارو، گراں گراں

ہوا کرتا تھا کبھی ایماں اوّل
آج فضا میں بھی ہے، گماں گماں

بھٹکتے رہے عمر بھر ہم یا رب
سکوں کی تلاش میں کہاں کہاں

مانا کہ ساحلؔ ہے سِن رسیدہ
پر دل اس کا اب بھی ہے جواں جواں

دل شکستہ نا ہونا دوستو کبھی
لیتا ہے رب، امتحاں امتحاں

قضا کا کرتی ہے پیری انتظار
اور رہتی ہے زیست ہر لمحہ، ہوشیار

عجب ہے موت اور حیات کا رشتہ
ملتے ہیں جیسے خزاں و بہار

زیست، مثال ہے بلبلے کی، ساحلؔ
اُسے آب کہوں یا مشتِ غبار

زندہ ہے حسرت تماشائی میں
جانے ساحل ہے کیسا دریا کے پار

کیوں جاتے ہو کرنے ماضی کی سیر
جب ملتی ہیں یادیں وہاں داغدار

بارش میں کرتا ہے گانے کو جی
فسوں گر ہے نغمہ، راگ ملہار

اُسے پھول ہی ملیں گے ہر جا، لوگو
دوست ہوں جس کے چمن کے خار

تعبیدار ہیں تیرے مان لے جانم
سچ کہہ رہے ہیں، اے حسیں سرکار

کرے جو چاہے یہ مطلبی دنیا
رکھنا ضمیر کو ساحلؔ تُو بیدار

وقت کا پابند ہوں، وقت ہے زنجیر
وقت سب پر حاوی ہے، مُرشد ہو یا پیر
کاسہ بہ دست فقیر یا ہو کوئی امیر
کون صغیر ہے ان میں اور کون کبیر
کھوکھلہ ہے دولت مند، خفتہ ہے ضمیر
عجب ہے یہ دنیا، ہوشیار ہے فقیر
نظر جھکائے آتے ہیں تیرے، منصف
کون گنہگار ہے، کون دامن گیر
بجھ چکا ہے نور دل میں انساں کے، یارب
ضمیر جگا، لَو جلا، باطن کر مُنیر
پیش رفت ہنگامہ ہے، کریں جو چاہیں لوگ
خموش ہو کر سُن ساحلؔ، کیا کہتی ہے تقدیر

سنجیدگی بھی ساحلؔ کیا نامراد ہے
مسخروں کی جہاں میں داد ہی داد ہے

کرتب گاہ ہے یہ دنیا، تماشائی سب
نقال کی زباں تو پُر آزاد ہے

آساں ہے قدم رکھنا راہِ دروغ پر
راستی کی راہ تہ یارو بہت بے داد ہے

کیا ہوا ہے خدایا قہر کو تیرے
جب ہر سُو یہاں، محض استبداد ہے

کبھی بستا تھا دلوں میں حق کا تصور
ساحلؔ، آج حقیقت جہاں کی ارتداد ہے

آتشِ گل، خاکِ زمیں، اُجڑا گلستاں
کس کا ہے ساحلؔ بتا، اُڑتا ہوا دھواں

مت بہاؤ اشک یارو پریشانی میں تم
کیا کرو گے اٹھے گی جب دردِ دل کی فغاں

سوال کرنا ہے یارو تو خود ہی سے کرو
سوکھے چشم سے پوچھو اشک کتنے ہیں گراں

کبیر ہے کتنا تیرا زنداں، اے انساں
قید ہے تُو حدودِ زمیں و آسماں

سُنا اے ساحلؔ کہانی تُو زیست کی اپنی
مت سُنا داستاں کوئی حدیثِ دیگراں

تشریحِ محبت

بندش ہے، زنجیر ہے، نام محبت ہے
وفا ہے اساس، بنیاد صداقت ہے
فطرت تو دل کی ہے خانہ بدوشی، لوگو
پر آورگیٔ دل تو عدوات ہے
کرو جس سے چاہو محبت تم یارو
خود سے محبت بھی ایک ضرورت ہے
کبھی بنتی ہے راکھ الفت بھی، دوستو
پھر تو بادِ صبا بھی عقوبت ہے
دو رِمحبت بھی عجب ہے ساحلؔ
دل روشن اور ذہن میں ظلمت ہے

کیوں پوچھتے ہو لوگو میرا پیشہ ہے کیا
تم ہی بتاؤ یہ بے کاری ہے کیا
ساقی سے پوچھتے ہیں لوگ، میخواری ہے کیا
چارہ گر سے ساحلؔ، دل کی بیماری ہے کیا
تیری محفل میں شیخ یہ ٹوٹے ستارے کیسے
ستاروں کی فلک سے ہوئی آتش باری ہے کیا
راز پنہاں ہیں سب کے دلوں میں جب
کیا بتائیں تمہیں پردہ داری ہے کیا
خورشید کا آمد و رفت مضطری نہیں
تو بتاؤ پھر لوگو بے قراری ہے کیا
رب کے ہوتے ہوئے سمجھاؤ تم، یارو
حیات کی ذمہ داری ہماری ہے کیا
یارو، موت تو موت ہے، کاری نہیں موت
بتا پھر ساحلؔ، خوفِ موت کاری ہے کیا
کیوں بناتا ہے تُو انساں، فضاؤں میں کاخ
پائدار، ہواؤں کی سواری ہے کیا
یارو ہر روز جو لگاتا ہے شرط تم سے
وہ آفتاب تم سے کم جواری ہے کیا

چراغِ راہ کیا بتائے منزل ہے کہاں
ڈوبتی کشتی کیا بتائے ساحلؔ ہے کہاں

کس سے پوچھتے ہوسوال ذرا سوچو، یارو
بے چارہ ذہن کیا بتائے دل ہے کہاں

جسے عادت ہو سونے کی ستاروں تلے
اُسے کیا خبر بالشِ مخمل ہے کہاں

ہر شے کا مقام بھی معین ہے یارو
جیسے ڈھونڈ لیتا ہے کاسہ نرم دل ہے کہاں

وہ مٹی کے کھلونے سے بڑھ کر نہیں ہے
دوستو، انساں سے نہ پوچھنا، گِل ہے کہاں

اُسے خود نہیں معلوم بے خودی ہے ایسی
کیا بتائے گا ساحلؔ، ساحلؔ ہے کہاں

ساحلؔ کا خمگاہ سے سروکار ہے بہت
راہِ شوق کے گلوں پر اعتبار ہے بہت

جلوے حُسن کے دیکھے ہیں یارو بہت، لیکن
برق کی تجلّی، بے مثل نظارہ ہے بہت

خانہ بدوش ہے یارو، یہ دل فطرتاً
قید ہے ضرور، لیکن آوارہ ہے بہت

تشنہ بیٹھا ہے کیوں لبِ دریا، مسافر
بہتے آب کی تجھے جب درکار ہے بہت

مانا کے ظالم ہے وقت کی شمشیر، پر
آزار میں یارو، وقت مددگار ہے بہت

ڈوبتی کشتی بتائے مفہوم ساحل کا
یارو، ساحل کا سہارا، سہارا ہے بہت

ساحلؔ، ذمّہ جہاں کا میرا نہیں ہے
میں نے کوچے کو اپنے سنوارا ہے بہت

سرد فغاں، رنجشِ بے جا، دل ہے اُداس
ایماں ہے، یقین ہے، خوشی کیوں نہیں ہے پاس
سوال اٹھتے ہیں کیسے ذہن میں اب ساحلؔ
کبھی اپنی تھی دنیا، اب چراغاں نہ کوئی آس
گر شب کو نہ سُناؤں، تو سناؤں پھر کِسے
داستانِ وقتِ جور ہے بے قراری کی اساس
ہم کیا کریں شیخ تیرے کاخ و گلزار کا
مطمئین ہیں ہم اپنے جہانِ افلاس
ہوگی پسند روانی دریا کی کسی کو
خودداری اُس کی آفرین، نہ ہو جسے کوئی پیاس
یارو، ہنگامہ بپا ہے جدھر بھی دیکھئے
کھو بیٹھا ہے جہاں اپنا ہوش و ہواس
ساحلؔ، کوئی ضروری تو نہیں ہے کہنی ہر بات
مت کرتُو باتیں جو نہ آئیں کسی کو راس

سر میں سودا، لرزتے ہوئے قدم
پر آرزوئے زیست سے نکلے نہ دم

گرداب تو ساحل ہے سمندر کا کھیل
کیوں کشمکش میں پھر، گھِر گئے ہم

مت کو سوتم یارو، سنگ دل، سنگ دل
اُس شیخ سے ملاؤ جس کی آنکھ ہو نم

انجام زندگی کا معلوم ہے سب کو
کیا بتائے گا لوگو تمہیں جامِ جم

اس پیش رفت کے جنوں میں کفر دیکھئے
بھولا ہے انساں پاک دیر و حرم

خوف نہیں ہے کسی کو زنداں سے آج
پروہ کسی کو نہیں گر ہو بھی ذم

شاعر ہوں، میرا کام ہے شعر پڑھنا
نہ سُنے کوئی، تُو تو سُن لے صنم

نام لوں گا غالب نہ فراق نہ اور
شاعر تو ہم بھی نہیں کسی سے کم

تُو چلتے چل ساحل تنہا ہی سہی
راہِ خدا پر خدا ہے، تیرا ہمدم

غمِ فراق کو لے کر کہاں جائیں گے
بیاباں کے گُل بھی اب ضرور ستائیں گے

عجب ہے یہ کتنا، دیکھ سلسلہ ساحلؔ
کہ حسیں گُل بھی آج رُلائیں گے

کوئی تو کہو جا کر اُس سنگ دل سے، یارو
ہم چہرۂ محبت انہیں دکھائیں گے

خفتگی سے بیزار، خواب نہ آئیں گے
ماہ و انجم نہیں، دل کے خار سُلائیں گے

کبھی ترستا تھا نغمہ گوشِ یار کو
اب لوری بھی ہم خود ہی کو، سُنائیں گے

حاصل ہو فتح میدانِ زیست میں یا نہ
ہم خود کو، یارو، تو نہیں ہرائیں گے

نبرد ہے یہ زندگی، اے قضا سمجھ
غلط فہمی نہ ہو کہ ہم ڈر جائیں گے

تو روٹھ بھی جائے ہم سے، گر ساحلؔ کبھی
تجھے تو، اے دوست، ہر حال میں ہم منائیں گے

اے جوانی، بہت یاد آتی ہے تُو
دورِ پیری میں بہت ستاتی ہے تُو

سوچتا ہوں جب جوانی کا میں
وہ بھڑکتی شب کی یاد آتی ہے تُو

آفتاب اور میں غروب ہوتے ہیں یکساں
پر، امیدِ صبح بہت ستاتی ہے تُو

میں سو رہا ہوں کرن، مت جگا مجھے
میرے خوابوں کو کیوں جگاتی ہے تُو

نغمے سُنا تُو اے عندلیب مجھے
سوزِ دل کے نالے کیوں سُناتی ہے تُو

اے بادِ صبا، کبھی رُک بھی تُو جا
پریشاں کیوں اُڑتی جاتا ہے تُو

میخوار ہوں، میکدہ ہے میری جاں　　تمنّائے بارش ہے، اے آسماں
تُو نہ برسے نہ گرے شبنم، نہ سہی　　اشک بہانا تو ہے آساں
گُل نہ ملے گر چمن میں دوستو　　چلو، ڈھونڈتے ہیں جا کر بیاباں
چار دن کا میلا ہے جہاں، یارو　　فضول ہیں پھر فغاں و گریاں
بہت ظالم، جاں لیوا ہے آرزو　　لیتی ہے یہ مکمل امتحاں

شکر منا لے اے ساحلؔ میاں
کہ دل میں خفتہ ہیں تیرے، ارماں

شیشہ ملے مزار پر تو بات ہے ساقی ضبط ہو جذبات پر تو بات ہے ساقی
در رہے کھلا تیرا آرزو ہے دوست صبح خواہ رات، تو بات ہے ساقی
ماہ جبیں سے ملا تو کوئی بات بنے آفتاب سے تو خوب ملاقات ہے ساقی
لیتے ہیں خواب ہم جاوِدانی کے زندگی تو بس ایک رات ہے ساقی

مضطرب کیوں ہے ساحلؔ، اے ساقی بتا
رند کو دیکھ، کیسی قناعت ہے ساقی

صبر کر ساقی طویل ہے راہِ میکدہ
نماز پڑھ کر کافر، آ رہا ہوں میں
چمن پرست ہوں، عزیز ہیں مجھے پھول
خاروں سے رِہا پا کر، آ رہا ہوں میں
کس غم میں غرق ہے عندلیب، بتاؤ
کہ نغمے چمن میں، سنا رہا ہوں میں
تیرے در پہ، اے ساقی، سب رند تو نہیں
رب کہ بندوں کو مئے ناب پلا رہا ہوں میں
نہ رانجھے، نہ فرہاد نہ وامق کی داستاں
اے ہمدم، کہانی اپنی بتا رہا ہوں میں
کور چمن ہے دنیا، کیا کروں ساحلؔ
آئینہ جہاں کو دِکھا رہا ہوں میں

نسخہ دے یا خموش بیٹھ، اے واعظ میاں
کیا ہے کوئی پاس تیرے دردِ دل کا درماں

سُنا تجھے محراب سے خطبہ پڑھتے ہوئے
لگا مجھ غریب کو تُو کچھ زیادہ ہی پریشاں

کبھی حسیں تھے خواب چندراتوں کے یارو
امید نہ تھی یقیں نہ تھا، نہ کوئی گماں

ویراں ہے میری بستی، خاک ہے وجود
مت پکڑا ئے تو قیامت، میرا اب گریباں

اس دورِ ہنگامۂ جہاں میں، دوستو
وہ یادیں خواں ہو جائیں نسیاں

کس لگن سے لکھتا ہے اے شاعر تُو
تیری تسطیر کی لکیر بنے رگِ جاں

کاسہ بہ دست کیوں گھومتا ہے، اے ساحلؔ صاحب
ہاتھ میں لئے سرا پنا، کل سرو ساماں

گل کو گلے کا ہار کیا　　محبت میں جیت اور ہار کیا
عدو نہ ہو تو یار کیا　　عداوت نہ ہو تو پیار کیا
خاک ہوا تخم خاک میں　　گل کا پھر انتظار کیا
مضطرب نہ ہو گر تُو کبھی　　اے دل، تیرا پھر قرار کیا
گر ویراں نہ ہو بستی کوئی　　کہو ارم اور گلزار کیا
خواب میں کسی پر وار کیا　　ہوا میں گھوڑا سوار کیا
کرتے ہو بات ماہ جبیں کی جب　　پھر حسن کا ہونا داغدار کیا
دوذخ نہ ہو تو فردوس کیا　　بن خزاں کی کہو بہار کیا
حسبِ حال پر ہے یہ تبصرہ　　خریدار نہ ہو تو بازار کیا
کاغذ کا پھول ہے ثروت، لوگو　　دولت مند اور دولت خوار کیا
جنگل بنا ہے یہ جہاں، دیکھو　　کہو، گناہ اور گنہگار کیا
گر شیطان نہ ہو ہر سُو، دوستو　　جنت میں پھر، پروردِگار کیا
مقرر ہے قضا، اے ساحلؔ میاں　　یہ موت پر رونا زار زار کیا

اجل سے خوف یہ کیسا یارو
زندگی کم آزار ہے کیا؟

رشک نہ کیجئے جہاں میں یار ہیں بہت
یاروں میں آستین کے مار ہیں بہت
حقیقت نہ سہی سراب ہی سہی
شادمانی کے ساحلؔ اوزار ہیں بہت
انتخاب مت کرو گلوں میں تم یارو
کہ چمن میں پھولوں کے خار ہیں بہت
اشک مت بہاؤ، چشم نم مت کرو
فل میں باراں کے آثار ہیں بہت
پہن لے لباس مفلسی کا، دوستو
کوتاہی نہ ہوگی، جاگیردار ہیں بہت
فراست مندی کے دعوے مت کرو ساحلؔ
سب یار ہی سہی، سمجھدار ہیں بہت

ماتم نہ مناؤ، مجھے نہ ستاؤ　　تڑپے گی روح میری، آنکھوں سے نہ پلاؤ
افسردہ، خموش، چشم نم نہیں　　آؤ اور آ کر تم گل طربت پہ برساؤ
گور میں ہے چمن، سکوں پُر ہوں میں　　تم قدموں کی آہٹ مجھے مت سناؤ
میں زندہ ہوں لوگو، زندہ ہی رہوں گا　　آئینۂ ماضی میں دیکھو، دل کو بہلاؤ

مروّت کی مجسّم ہے ساحلؔ، دوستو
اُسی نغمے تم اُسی کو سناؤ

اجتماعِ ماہ و انجم کا دیکھئے کمال
ایسی انجمن کا ساحلؔ ہے زمین پر محال

ستاروں کی چمک یا میرے ماہ کی دمک
عالمِ سفلی کا کمال، خواہ آلام علوی کا جمال

وہ پرواز کیا کرے گا تقابلِ عقاب
نہ ہوں جس کے پر اور نہ ہی ویسے بال

یہ پیش رفت بلا ہے دوستو کہو کیسی
آج پیسے نے کیا ہے ایمان کا پایمال

یارو، عقدیت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے
کبھی حلیف کا مت کرنا، ناجائز استعمال

کافر کو بنایا ہے خدا ہی نے دوستو
لئے پھرتا ہے اُسے وہ، اسی کا حمّال

حیران ہوں میں سُن کر، اے ساحلؔ میاں
لوگ کہتے ہیں تیرا، کلام ہے بے مثال

شمع کے مقابل رُخِ روشن کیا ہے
مجھ سے نہیں ساحلؔ، پروانے سے پوچھ
گر جلنے میں ہے جاوِدانی تو پھر
فنا ہونے کا لطف، اس دیوانے سے پوچھ
بے سواد ہے شراب، نہ ہی نشہ بے خودی کا
مئے کیوں ہے آج ایسی، تُو خزانے سے پوچھ
مست ہے ساقی اپنے پیالوں میں جب
کشش کیا ہے اس جا کی، میخانے سے پوچھ
در ہے دیوار ہے، باغیچے میں پھول
حاوی کیوں ہے تنہائی، آشیانے سے پوچھ
جام میں غرق رند کا انجام مت پوچھ
حضرتِ واعظ، زندہ کون ہے، زمانے سے پوچھ
کہانی در کہانی، حادثہ در حادثہ
کیسی گزری ہے زیست، یہ افسانے سے پوچھ
ساحلؔ، لے گیا تھا کسی کو فردوس تک معراج
سرِ بام ہے بہت دور، جذبۂ چاہنے سے پوچھ

وہ جو نظر سے مستور ہے　　وہی ظلمت میں دلوں کا نور ہے
پیکرِ حسن کا ذکر کیوں　　جب دل میں تصورِ حور ہے
بھٹکتے دل سے کیا گلے　　وہ بے بس و مجبور ہے
نخرے مت دِکھا ساقی، نہ پِلا　　نشیمن پہ میرے انگور ہے
لطف اندوز ہے بے وفائی　　ہائے، وفا بھی کیا دستور ہے

ہر سُو ہے شادمانی ساحلؔ
تیرے دل میں کیوں آج رنجور ہے

یوں بھی لا محدود تھی وسعت میرے ارماں کی
جستجو اس دل کو تھی تنہائی کے درماں کی
ہم نہ کہتے تھے ساحلؔ پیش رفت لے ڈوبے گا
بھولا ہے رب کو انساں، ضرورت ہے ایماں کی
ہر جا بستے ہیں شیطان یہاں مولیٰ
ضرورت ہے جہاں کو تیرے انساں کی
گُل گلستاں میں خار بنا بیٹھا ہے
تلاش ہے دوستو کسی پاک بیاباں کی
یہ تبصرہ ہے ساحلؔ تیری دنیا پر آج
حالت خستہ ہے دیکھ کیسی جہاں کی

یہ ظلمت بھری شب بھی تو کبھی تاباں تھی
بجھی ہوئی شمع بھی تو کبھی پریشاں تھی

عکس پیری کا شیشہ میں مت دیکھئے
ان آنکھوں کی مستی، بھی کبھی جواں تھی

مرجھاتے گل پر افسوس کیسا، فنا لازم ہے
اُس گُل کی بھی تو کبھی آن بان وشان تھی

یارو، مشکل ہے بہت کرنا حقیقت کا سامنا
ناصح کی کہانی تو دلچسپ و آساں تھی

عدل ہو ہمیشہ یہ ضروری تو نہیں
ساحلؔ، قسمت خود اپنے کئے پر حیراں تھی

چھوڑ کر ساحلؔ چلے بحر کی ہم سیر پر
اپنی کشتی ہے بھنور میں زور ہے طوفاں کا

لطف نہیں اب کوئی بیٹھنے کا ساحل پر
زور ہے بہت دیکھو، اُس پار کے ارماں کا

کس رخ لے جائے گی صبا کسے کیا خبر
بس نہیں ہے کشتی کا، نہ ہی بادباں کا

قریب ہے جنت کے گر فلک تو پھر کیا ہوا
کیا بھروسہ فردوس کا اور تقدیرِ آسماں کا

معلوم ہے ساحلؔ فنا ہی حقیقت ہے
کیا کریں لیکن بتا ارمانِ جاوِداں کا

منتظر ہے دھواں کا، آسماں آسماں
پرواز کر رہا ہے، دھواں دھواں

ہوا کرتا تھا اوّل کبھی
آج فضا میں بھی ہے، گماں گماں

محبت کی ہم نے عزّت مکمل
راز دل میں رہا، پنہاں پنہاں

روک سکتے ہو شیخ تو روک کر دِکھاؤ
دریا کا بہنا ہے، رواں رواں

مت بہاؤ انہیں تم دریا کی مانند
آنسو ہوتے ہیں یارو، گراں گراں

بھٹکتے رہے عمر بھر ہم دوستو
تسکین کی تلاش میں، کہاں کہوں

مانا کے ساحلؔ اب ہے سِن رسیدہ
پر دل اُس کا ہے، جواں جواں

جفائے عشقِ بتاں کی بات مت کر
ساحلؔ، گزرے زمانے کی بات مت کر

خورشید، نہ شمع نہ ہی ماہ و انجم
ہر سُو ہے ظلمت، جائے فروزاں کی بات مت کر

میرے اشکوں کو دیکھ کبھی بیٹھے ہوئے
دریا ہے رواں، تُو طوفاں کی بات مت کر

آج دیکھی ہے میں نے رونق چمن کی
آشفتہ ہوں، دلِ ویراں کی بات مت کر

میرا حافظہ ہے صاف مانندِ شیشہ
بھُلا دیا ہے ماضی، نسیاں کی بات مت کر

ہر شے ہے نہاں، ہر دل میں ہیں راز
چاند پہنے ہے نقاب، عریاں کی بات مت کر

مجھے قید کیا کرے گا، اے بدنصیب شیخ
اسیر ہوں ارماں کا، زنداں کی بات مت کر

گلستاں، بیاباں، گرمیٔ بازار، بس
فقط انہیں سمجھ لوں، جہاں کی بات مت کر

اصلیتِ زیست غزل نہیں ہے ساحلؔ
کاتبِ تقدیر، غزل خواں کی بات مت کر

بُنتے تھے خواب کبھی اوروں کے
اب اپنی خاطر سوتے ہیں
فکر کبھی دنیا کی تھی
اب اپنی خاطر روتے ہیں
تخم بوتے تھے غیر باغوں میں
اب آنگن میں ہی پروتے ہیں
خود غرض نہیں ہوئے ہم ساحلؔ
بس، مجبوری کو ڈوبوتے ہیں
پر، دیکھ کر ہر صبح خورشید کو
بیج اب بھی اُمید کا بوتے ہیں

سکوں ہے یہ کیسا، نہ غم نہ اُمید　　نہ ماتم کہیں نہ ہی جشنِ عید کوئی
عجیب ہے یہ کیسا افواہوں کا زمانہ　　بے بنیاد کہانیاں، سُنید نہ دید کوئی
تیرا روز کا خطبہ بے اثر ہے اب واعظ　　داستاں سُنا تُو اب حمید کوئی
دیکھو عشق بھی یارو کھوکھلا ہے کتنا　　نہ قربانی کہیں نہ ہی شہید کوئی
کہہ گئے جو غالبؔ، میرؔ اور اقبالؔ　　چند شعر تو سُنائے مقابل جدید کوئی

التجا ہے تجھ سے ساحلؔ کی خدایا
کبھی حوصلے سے نہ دینا درد مزید کوئی

عاشق ہوں دل سے مانا، کہو کیا یہ گناہ ہے
اماوس کی رات ہے، کیوں آسماں میں ماہ ہے

نہ دیا کسی کو دھوکا دیدہ و دانستہ
مانو یا نہ مانو، دل اس بات کا گواہ ہے

اُٹھا ہے ابھی جنازہ، بھٹک رہے ہے روح
یہ شور و غُل ہے کیسا، یہ کس کی جلوہ گاہ ہے

چاک دامن نہیں ہے میرا، شک و صبح سے میں دور
پھر حجاب میں یہ کیسی دُزدیدہ نگاہ ہے

مجلس نہ کوئی مابعد نہ بُت خانہ یہاں کوئی
تُو ہی بتا واعظ، یہ ویرانی کس کی خانگاہ ہے

سر بہ سجدہ ہیں سب، تیری انجمن میں شیخ
تُو اتنا تو بتا دے، دعا کون سی اور کون سی آہ ہے

بہشت کو نہ دیکھا ہم نے دوستو ابھی کہیں
دعا کرتے ہیں ساقی، ہو جیسی تیری خمگاہ ہے

اب مثلِ دریا ہے ساحلؔ، جبل سے بہت دور
پوچھتے پھرتے ہیں سب سب، کیا یہ بحر کی راہ ہے

موت سے کیا ڈرنا، موت تو نجات ہے
فانی ہے دنیا، فانی حیات ہے
نفس کا آمد و رفت ہی کل زیست ہے
جاوِدانی تو محض خدا کی ذات ہے
کیا مانگتے ہو رب سے دعا میں تم لوگو
صبح شام کا تماشا ہی اُس کی سوغات ہے
خوب جانتا ہے شاطر داؤ پیچ پھر بھی
آج جیت، پھر کل مات ہے
دعوے تو کرتے ہیں یہ اہل سیاسی
بھول جاتے ہیں لیکن یہ کس کی کائنات ہے
پیش رفت ہوئی ہے آج، دنیا میں لوگو اتنی
پر ہاتھ میں میرے اب بھی قلم و دوات ہے
آرزو، تمّنا، خواہشیں تمام
سوچتا ہوں دوستو کیا جینا بھی جذبات ہے
اتنا بھی نہ کر زیست سے پیار ساحلؔ
کہ مختصر بہت اس سے ملاقات ہے

ریاضِ الفت میں موجۂ گُل چراغاں ہے
جس طرف دیکھئے ادھر رنگِ بہاراں ہے
سمجھ جاؤ گر یارو داؤ پیچ محبت کے
زندگی بھر اُسے نبھانا پھر آساں ہے
ورنہ، روزگارِ الفت صرف مشکل ہی نہیں
سلاخوں کی وہ ایک دُشوار زنداں ہے
ہم نے تو نہ مانا کبھی دشمن کسی کو
یارو، خار بھی تو آخر گلوں کا پاسباں ہے
اُس نے سہی سمجھا ہے مفہومِ حیات، ساحلؔ
قابو میں جس کے ایک حسیں زباں ہے

اصل گوہر ہیرا نہیں، سکوں ہے
ہر بشر اُسی کا ہی تو ممنوں ہے
دوستو، نیک سیرت اور ایک شیریں زباں
یہ حقیقی خزانۂ قارون ہے
ڈھلتا سورج دیکھ کر حیراں کیوں ہے ساحلؔ
ہر صبح کی تمنا تو بس جنوں ہے
ماہ و انجم بھی یار، شکار ہیں وقت کے
شب و روز کا تماشا تو فسوں ہے
بتا، حاصل کیا ہوگا امیدوں سے صرف
ارادہ ہی بشر، گر تیرا زبوں ہے
جاوِدانی بھی یارو سراب ہی تو ہے
آج ارسطو کدھر، کہاں افلاطوں ہے
یاد کرتا ہوں میں جدِّ امجد کو اپنے
کہ رگوں میں میری، بھی وہی خوں ہے
تجھ پر یقیں کیا کروں، اے زندگی، بتا
جب تُو خود ہی قضا کی مرہون ہے
پھر کیوں، اے ساحلؔ ہے چاہ اس کی اتنی
کہ ہر انساں زیست سے مفطوں ہے

کیا نہیں ہے چمن کوئی خاروں بغیر
اُس زیست سے ملاؤ جو ہو آزاروں بغیر

ساحلؔ، محل پتھروں کے، زر کی آرائش
پر ، فلک ہے گھر تیرا دیواروں بغیر

اے خاک میری ہمسفر، وہ نظارہ دکھا
وہ عرشِ بریں، ان ستاروں بغیر

دو آتشہ ہے ساقی، مَے تیری آج
کیوں باغباں کا گلشن، ہے انگاروں بغیر

کیا ضروری ہے خواب نیندوں کے لئے
ہم نے دیکھیں ہیں گل خفتہ، بہاروں بغیر

رحمت کے طالب ہیں بندے تیرے مولیٰ
اور نہیں ہے یہ دنیا سزاواروں بغیر

کیا کریں گے ہم ساحلؔ دانشمندوں کے بیچ
ویران ہے وہ محفل ، اپنے یاروں بغیر

ذرّہ خاکِ دل کا ، کہو تاباں کیا ہوگا
ریت پر نقشِ پا کہو نشاں کیا ہوگا
مت بننا تُو اسیر ساحلؔ دل و دماغ کا
اُس سے بڑھ کر کوئی زنداں کیا ہوگا
جستجو تسکیں کی ہے، اے عابد، اے میخوار
گر دل میں نہ ہوسکوں، تو وہاں کیا ہوگا
کیوں تکتا ہے رشک سے ماہ و انجم کو
راہی، فردا کی خبر نہیں، جاوِداں کا کیا ہوگا
کوئی نہ سُنتا ہے تیری نہ تیرے واعظ کی
بتا اے حامیٔ بیکساں، اب کیا ہوگا

فلک سے مانگتا ہے کیا، خلا سے ملے گا کیا
ساحلؔ، مولیٰ گر رحیم نہیں، آسماں کیا ہوگا

یہ گفتگو کیسی، وضاحتوں میں ابہام ہے
گمنام ہوں، پھر بھی ایک میرا نام ہے
ہنگامۂ بازار کا شور و غُل تو نہیں
پر، دہر میں میرے پُر فرجام ہے
تسکینِ تنہائی تو بے نظیر ہے، یارو
کوچے کی خلوت میں مستقل آرام ہے
پھول آنگن میں ہیں ہمسفر میرے
اُنھیں روزانہ میری دعا و سلام ہے
بن بلائے شیخ، ہم کہیں نہیں جاتے
در و دیوار، پاسباں، یہ کیسا نظام ہے
خاک کا حصّہ ہوں، زمین پر ہیں گام
پرالتجا میری، اے ساحلؔ، سرِ بام ہے

واضح، غیر واضح یہ بحث ہے کیوں
شب و روز کا بھی مقام ہے الگ
لگامِ حکومت تو ہے تیرے ہاتھ
شیخ، تیرا اور میرا کام ہے الگ
میرے ہمسفر، ہمنوا، ہمراہی
سفرِ زیست پر لیکن انجام ہے الگ
نازک تیرے گام، ہے حسیں تیری چال
جاناں ، ادائے برقِ خرام ہے الگ
سجاتی ہے مکڑی جال اپنا ہر روز
کمبخت انساں کا سجا، دام ہے الگ
ہم نے کی ہے سیر جہاں بھر کی یارو
گھر اپنے کا لیکن آرام ہے الگ
ساحلؔ، کب تک پئیں گے مَے ناب ہم
ساقی کے یاں تو گلفام ہے الگ

جب ہر خوشی میں رنج وغم ہے شامل
ڈھونڈتا ہے کیوں تُو وجہٗ سکوں ساحلؔ
جدھر ملے تھام لے دامنِ تسکیں توٗ
یقین کیا ہے وقت کا، کب بنے سنگ دل
وہ صبا لاتی ہے جو آنگن تیرے بہار
خزاں کی بھی وہی ہوا تو ہے حامل
فنا ہوا ہے دنیا سے نام حق کا آج
دیکھ لو جدھر چاہو ہر شے ہے باطل
منافق ہے یہ دنیا کیسی، دیکھ لے اے ساحلؔ
لبوں پر تبسم ہے، پر دل سب کا بسمل

کیوں ہوتا ہے مایوس بے سبب یہ دل
وجود اس کا اپنا ہے، اے دوست ساحلؔ
اختیار نہ تیرا نہ کسی اور کا
ویرانہ ہو، خواہ ہو بھری محفل
راہ اپنی پر چلتا ہے دل یہ سب کا
یہی جانے قافلے، یہی خود کی منزل
دل نازک ہے بہت، بسمل ہوتا ہے آساں
زخم اس کے گہرے، جانے کب ہوں مندمل
نا داں ہے، بکھر جاتا ہے یہ
یہ کھلونا سا دل کیوں بنتا ہے سنگ دل

چاہ نہیں ہے کاخ کی، میرا سائباں بہت ہے
آرام کے لئے، اے دست شیخ، آسماں بہت ہے
قامت کیا ہے تیری شاہ، بندہ تُو رب کا ہے
مولیٰ سب کا ایک ہے، وہ مہرباں بہت ہے
وحشت پُر اس دنیا میں، خون خرابہ بہت ہے
آنسوؤں کا دریا یارو، ہر سؤ رواں بہت ہے
ظلمت پر یقیں جب تھا، وقت وہ بھی دیکھا ہے
جس طرف آج دیکھئے، شک و گماں بہت ہے
ہنستے چہروں کے دل ساحلؔ، خوش نہیں ہیں، بتا کیوں
پوچھو تم مولیٰ سے یارو، یہ گلشن ویران بہت ہے

لے گئی ہے آرزو نیند اب جانے کہاں
کیا ہے کوئی اب پاس میرے لوری سنانے والا
عمر گزری تکتے ہوئے ہاتھوں کی لکیروں کو
ان میں پنہاں کیا ہے، ہے کوئی بتانے والا
سکوں کا لطف جاننا ہو تو لازم ہے یہ یارو
پاس تمہارے ہمیشہ ہو، ایک ستانے والا
ناراض ہو کر جاؤ گے تسکین ملے گی کیا
نہ ہو اگر پاس تمہارے کوئی حسین منانے والا
گل ہے گلشن ہے، باغباں اور جھولا بھی
چاہیئے ساحلؔ ایک ہمسفر، جھولا جھلانے والا

ساحلؔ، صبح کے سورج کو تُو سلام کر
پھر، شب کو کر وداع، اور آرام کر
از خود کر بے پردہ، جنون تُو اپنا
جو بھی دل میں آئے پھر، اُسے تو اظہار کر
مانا ،صبح و شام کا کھیل ہے زیست
مگر، بکھرتی ہے یہ حیات، کچھ انتظام کر
بدلا ہے زمانہ آج، پیری ہے ایک جرم
تُو رکھ زندہ اقدار اپنے، بزرگوں کا احترام کر
کیوں دکھانی لوگوں کو صداقت اپنی ساحلؔ
گفتگو مولیٰ سے تُو ، جا سرِ بام کر

رہتی ہے بات دل کی، پاشِ پردا ہمیشہ
اظہار بھی کیا جائے تو ادھوری ہی ہمیشہ
پھسلتی زباں پر یقیں کیا ہو، کہو
جب دل کو رہتا ہے ایک عجیب سا اندیشہ
نہ پہچان پاؤ غیروں کو تو کوئی بات نہیں
یارو، اپنے آپ کو تو جانو، ریشہ ریشہ
وقت کو نہ کوسو بدلنا ہے اس کی چال
گردشوں کا غلام ہی رہتا ہے وہ ہمیشہ
ضبطِ ضخن تو وصف ہے کمال کا ساحلؔ
رواں رہنا تو ہے بیچاری زباں کا پیشہ

قصّہ سنا ساحلؔ کہن بہار کے
سبز شجر اور برگ و بار کے
چہچہاتی چڑیاں، جرسِ شبگیر
نغمے سُنا کوئی راگ ملہار کے
بات کر چمن کی، گلاب اور ثمن کی
سنتے ہیں روز لوگو، قصّے ہم دار کے
ہنگامے دیکھو یارو، جہاں بھر کے آج
زمانے یاد آتے ہیں یارِ غار کے
ہنستے چل ساحلؔ، رونے کو بہت ہے
لب پر رکھ الفاظ سکوں اور قرار کے
دل بھر آئے دوست تو فکر نہ کرنا
خواب لینا پھر تو آسماں کے پار کے

انسان کا مذہب انسانیت ہونا چاہئے
ساحلؔ، پیراہن جو چاہو پہناؤ اُسے
دل صاف و شفاف، من آئینہ کی طرح
پھر، جسے چاہو دکھاؤ اُسے
گر مانتے ہو یارو خدا نے ہے بنایا
تو خبطِ مذہب مت دکھاؤ اُسے
جب تفریق نہیں ہے مذہب کا مدّعا
تو ہر حال میں پھر دفناؤ اُسے
کیا خواہش منکر کی جنت نہیں ہے
اے مذہب کے رکھ والو، اپنا وَاُسے
ساحلؔ، ضبطِ سخن میں ہی فراست ہے
یارو، کوتاہی دل میں ہے، سمجھاؤ اُسے

تیرے کاخ وگلزار، تیرے ذر کے رہگزر
ساحلؔ، میرا کوچہ، میری گلی، میرے ہمسفر

یارو خوشی کا تعلق امیری سے کیا ہے
ویرانی میں ہے دل خوش، تنگ نہیں نظر

تجھے فرست کہاں شیخ، کہ ماہ کو دیکھ تُو
ہمیں دل کی شمع دکھاتی ہے ظلمت میں بدر

نہ میخانہ کہیں نہ دیر وحرم کوئی
اے ناصح بتا، کیا یہ ہے مولیٰ کا ڈگر

مانا کہ جاوِدانی تو سراب ہے ضرور، پر
زندگی تو ساحلؔ میاں ہے ایک طویل سفر

''یہ کیا جگہ ہے دوستو، یہ کون سا دیار ہے''

یہاں ہر پرندہ مجھ جیسا ہے، ہر پل میرا یار ہے

بادہ ہے مجھ سے کوسوں دور، نشہ ہے کچھ عجیب

ہوش و حواس میں ہے سکوں، غضب کا خمار ہے

ہر سؤ میرے اِک جام ہے، تسکین سے بھر پور

ارم کے نظارے، نہ کوئی شور و غلِ بازار ہے

تنہائی ہو تو ایسی ہو، اور ایسی جگہ میں ساحلؔ

ہر شے گویا ایک ہمسفر، ہر شے میرا دلدار ہو

''یہ کون سی جگہ ہے دوستو، یہ کون سا دیار ہے''

ہمیں بھی بلا بلا لے دوست، مانا تجھے قرار ہے

یہ کیا جگہ ہے دوستو یہاں خدا کی بھی چلتی نہیں

کیا کروں، کیا نہ کروں، مجھے کھُلا اختیار ہے

ہر جا ہے گل ، ہر جا چمن ، نہ گرد نہ غبار ہے

یہ وہ جگہ ہے ساحلؔ میاں جہاں خزاں کا نام بھی بہار ہے

آوارگی

آغاز ہے یہ کہ انجام کسی فسانے کا
حقیقت یا سراب جدید زمانے کا
کیا ساقی نے نہ دی تمہیں جگہ سونے کی
کہو، کیا یہ وقت ہے کوئی گھر آنے کا
نشیمن ہے یہ کوئی مسافر خانہ نہیں
درجہ دیا ہے تم نے خمگاہ کو آستانے کا
تُو ہی بتا کیا کہتی ہے صدائے صبوری
ساحلؔ، یہ کوئی وقت ہے کیا صبر آزمانے کا
سکوں چاہئے یارو، بسرِ زندگی میں
کیا کریں گے ہم قارون کے خزانے کا

مختلف ہیں طریقے دل کو بہلانے کے
بیتاب دل کو ساحلؔ بھی سمجھانے کے
مابعد، خمگاہ یا کہکشاں فلک میں
نیند نہ آئے تو شب کو بِتانے کے
سر بہ سجدہ رہو، خواہ پوجا کرو
دل کی صدا کو رب تک پہنچانے کے
وحدانیت کے قابل تھے انساں کبھی
خیال بدلے ہیں دیکھو جدید زمانے کے
ساحلؔ، جانے کتنے خدا ہیں دلوں میں آج
لوگ ڈھونڈتے ہیں ذریعہ خود کو ستانے کے
کیا نہیں ہے یار وفراست مند کوئی
خدایا، تو ہی بتا راز فاصلے مٹانے کے

یوں فرطِ شوق میں گزری ہے حیات تیری
ساحلؔ، سنتے آیا ہے دل ہر بات تیری
کیا یاد آتی ہے گھر کی خمگاہ میں تجھے
جب بسر ہوتی ہے ستاروں تلے رات تیری
کر تسلیم، اے زندگی، اجل ہی ہوگی غالب
چل لے چال جو چاہے تُو ہوگی مات تیری
اے خورشید، وقت تیرا بھی ہے مقرر ضرور
ڈھلے گا دن اور ہوگی پھر اندھیری رات تیری
کب تلک روٹھے گا تُو زمیں سے، اے فلک
مٹے گی کب یہ تشنگی، ہوگی کب برسات تیری
محفل ہے یہ میخانوں کی بے ہوش ہے یہ دنیا
مانیں ہم، ساحلؔ تجھ کو سنے گر کوئی بات تیری

عجیب ہیں لوگ، بستے ہیں جو، قریب تیرے ساحلؔ
نہیں ہے کیا دلوں میں اُن کے، تجھ سے نازک دل
مئے ہے، صبو ہے، ہنگامہ بہ پا ہے ساقی
پھر کیوں ہے، سونی بے جان آج، میکدے کی محفل
جام ہوں مساوت کے، تفریق نہ ہو کوئی
میخواروں میں ہے ہمسری، جام نہ ہو غافل
مشکل ہے سکوں کا رہنا مستقل، یا یارو
نسخہ کیا ہمیں بتا، اے پُر تسکین ساحلؔ
آساں نہیں ہے حاصل تسکین، حائل ہیں بہت
مانئے کاظم کو دوستو، ہر حال میں قابل

اپنے ہی خبط مزاج کا گنہگار ہوں میں
زنجیریں کس کام کی، خود میں گرفتار ہوں
بے خودی میں ہوتی ہے جب رب سے گفتگو
مت کہو یارو مجھے کے ہوشیار ہوں میں
خزاں میں بھی تو کھلتے ہیں پھول صحرا کے
تبسم دیکھ کر نہ سوچنا، گلِ بہار ہوں میں
ساحلؔ ہوں، دل نرم ہے، پتھر نہ پھینکنا
پیری کے اس دور میں، بوسیدہ دیوار ہوں میں
رب کہو اللہ کہو یا کہو تم بھگوان
سر بہ سجدہ نہ سہی، حق کا پرستار ہوں میں
دل صاف ہے دوستو ساحلؔ کا، صاف شیشے کی طرح
کہے جو چاہے منافق دنیا، یاروں کا یار ہوں میں

سلگ رہی آگ اب، باطن میں ہے دھواں
کیا اسی لئے لگتا ہے آج اداس یہ آسماں

ابر نہیں چاروں طرف اندھیرا سا چھایا ہوا
نہیں ہے فلک میں ساحلؔ، کیوں کچھ بھی چراغاں

فضا میں گر صبا نہ ہو تو جینا ہے محال
تکتی ہیں فلک سے آنکھیں،حلق میں تڑپتی جان

بیرون میں گر ڈھونڈو گے سکوں کے تم اسباب
سراب بنتے ہیں یارو پھر دل کے سب ارماں

وزن ہو جب دل پر تو جبل ہے مانندِ پر
نہیں ہوتا اُٹھانا ساحلؔ، اُسے کبھی آساں

ملانا ہے تو کسی پیرِ مغاں سے ملاؤ
رہبر ہو گر، راہ جنت کی دکھاؤ
گُل وخار ہوتے ہیں چمن میں ساحلؔ
پرندے ہو تو چہچہا کر دکھاؤ
زمیں پر ستارے تو بجھتے ہیں روز
فلک کے ستاروں سے ایک روز ملاؤ
روشن ہے راہ تمہاری گر قسمت بدولت
گھر جا کر اوروں کے، اُن کے دیئے جلاؤ
امیدوں اور خوابوں میں جاگتے رہے
ساحلؔ، تم ہی ہمیں آ کر سکوں سے سُلاؤ

ایک تخم میں نہاں ہے سہارائے حیات
ساحلؔ، تُو گُل و خار کی بات مت کر
مات زندگی کی تو تَے ہے، اے قضا
تُو جیت اور ہار کی بات مت کر
ایک بوند کی طالب ہے سوکھی زمین
اے ابر، تُو قطار کی بات مت کر
آئینہ لایا ہوں منصف، غور سے دیکھ
کسی اور گنہگار کی بات مت کر
پیاں شکاں جہاں میں، واعظ
تُو آج اعتبار کی بات مت کر
فلک ہے میری چاہت، اے ساحلؔ
تُو در و دیوار کی بات مت کر

قطعات

ساحلؔ، منتظر بیٹھا ہے ہر انساں
کے فرشتۂ اجل کی سواری آئے گی
اے شیخ، سنبھل جا
ایک دن تیری بھی ضرور باری آئے گی

آج کے ماحول پر تبصرہ

خدا نہ کرے کبھی ہو ایسا
خدا ملے تو ایسا ویسا
ماحول ایسا ہے جہاں میں ساحلؔ
ہر ایک کی زباں پے، ہے خدا پیسہ

الفت ہے مجھے تنہائی سے اپنی
یار اپنا ہوں میں بہترین
مبارک ہوں تجھ کو کاخ و گلزار
ساحلؔ، نہیں ہوں میں شوقین

کبھی غم میں تھے ڈوبے ہوئے
کبھی غرق موجِ دریا میں
طوفان سے تھا کبھی رابطہ
کبھی جستجو ساحل کی تھی

اب نظر میں نہ کنارا کبھی
منجدھار میں کشتی ساحل سے دور
تسکین تو ہے باطن میں ساحلؔ
پر وقت کرتا ہے مجبور

ہنوز خوشبوئے بہار مہکتی ہے
ہنوز بلبل چمن میں چہکتی ہے
نہیں خزاں سے عداوت کوئی ساحلؔ
ہنوز لَوئے اُمید دل میں دھکتی ہے

حال دیکھئے یارو آج کے دیندار کا
مابعد اور پرستار کا
دعا مہر کی نہیں، آرزو دولت کی
بتا ساحلؔ کیا ہوگا ایسے گنہگار کا

خاک تو بندھو خاک ہی ہے
خاک نہ جانے کوئے
چلتا پھرتا مانُش بھی
ساحلؔ، ایک دن خاک ہی ہوئے

اے حامیٔ بے کساں، کہاں ہے لامکاں
تلاشہ ہے میں نے یہ سارا جہاں
آ تُو ہی بتا اے مولیٰ میرے
ملے گی تسکین اب مجھے کہاں

دمِ تحریر جب آتا ہے یہ خیال مجھے
گر بنا لے کوئی نشانۂ سوال مجھے
بتا ساحلؔ، گناہ تجھ سے سرزد ہوئے ہیں کتنے
جواب دینا اُسے کتنا ہے محال مجھے

وقت کی ریت پر یہ تحریر کیسی
آب میں تیری یہ تصویر کیسی
ساحل پر کھڑا ہے ساحلؔ تُو
وقت کی پھر یہ زنجیر کیسی

گلستاں میں گلوں کا ہونا تو لازم ہے
بیاباں میں گُل دکھلاؤ تو کوئی بات بنے
آفتاب کے ڈھلنے سے اندھیرا تو ہوگا ہی، مگر
ساحلؔ، ہمیں تم چاند دکھلاؤ تو رات بنے

نہ خود پر اختیار نہ کسی اور پر
اسی کو یارو پیری کہتے ہیں
دورِ زندگی، صبح و شام کا تماشا
اسی کو ساحلؔ مستقل بھمبیری کہتے ہیں

اے حامیٔ بے کساں، کہاں ہے تُو اے لا مکاں
تلاشا ہے میں نے تیرا جہاں
آ تُو ہی بتا، اے مولیٰ میرے
ملے گی تسکیں اب مجھے کہاں

شیخ، چاہ نہیں ہے کاخ کی، سائباں بہت ہے
نیندوں کے لئے میری یہ آسماں بہت ہے
قامت کیا ہے تیری شاہ، بندہ تُو بھی رب کا ہے
مولیٰ سب کا ایک وہ، مہرباں بہت ہے

مت پوچھ اس سے تبسم کیا ہے
اُس ابر کا نام تو باراں ہے
بہار کیا جانے رنج و غم
اُس درد کا نام تو خزاں ہے

چمن کو جلتے دیکھا ہو جس نے
اسی کو شعلۂ غم حاصل ہے
راکھ دیکھی تو کیا دیکھا ساحلؔ
وہ سب کی انتہائی منزل ہے

یہ چاند اور ستارے ہیں تحفۂ نیم شب
ساحلؔ، وہ صبح کا سورج ہے سحر کی سوغات
کیا کمال بنائیں ہیں تُو نے، یارب
فروزاں یہ دن اور یہ ظلمت بھری رات

راہ گھر کی ہم ساحلؔ کھوتے رہتے
خمگاہ میں دامن بھگوتے رہتے
داغ تجھ پر بھی ساقی لگے گا ضرور
گر نشیمن میں تیرے ہم سوتے رہتے

ایک قطرہ پسینے کا، گرا جو کاسہ میں
مہک آئی اس سے ساحلؔ، گویا گلاب کی
سوچا پھر کرتے ہیں، فضول میں ہم یارو
تمنّا کیوں مسلسل، مجازی اسباب کی

ساحلؔ، باطن میں ہے خدا تیرا
صدا دل کی سن لے سکوں ملے گا
سوئے گا پھر نیند خوابوں میں
نام رب کا ہو لب پر، کامل جئے گا

اس رفتارِ پیشرفت سے کیا ملا ہے ساحلؔ بتا
نہ سکوں ہے کسی کو نہ چین و امن کہیں
ہر سُو ہے فتنہ، لوگ بٹ رہیں ہیں
میدانِ جنگ ہے دنیا، نہ چمن نہ ثمن کہیں

باغباں، بے لطف ہے اب چمن میں آنا
کہ خاروں نے کیا، بند بلبل کا گانا
ضبطِ سخن، ضبطِ زباں، ضبطِ ضمیر
ساحلؔ، جُرم ہے کسی ہستی کا مٹانا

کھیل ہے یارو، میدانِ جنگ مت بناؤ
کھیل کو مل کر سہرا پہناؤ
ساحلؔ، جواں خوں کیا جانے ظلمِ تقسیم
کُہن ہیں بہت وہ ظالم گہرے گھاؤ

میں نے کچھ نہ مانگا نماز میں
بس، کرم تیرا چاہیے اے میرے رب
ساحلؔ، کہیں بھول نہ جاؤں میں اسے کبھی
جب در پہ ہو قضا اور جان بہ لب

دانے کتنے ہیں تسبیح میں زاہد بتا
تیری عبادت کا حساب تو لے لوں
چمن کا سلون نماز ہے یارو
ساحلؔ، چل ایک گلاب تو لے لوں

غزل کیا بس صدائے دل، ساحلؔ
نظم تو ذہن کا تماشا ہے
عبادت میں چاہ خدا کی
میکدے میں ساقی تو صرف نشہ ہے

ہوگا جب سامنا اُس تجلّی سے تیرا
ہوگا جل کے خاک یا روشن جگر تیرا
ساحلؔ، موسیٰ نہیں ہے تُو، رہے تجھ کو یاد
ڈگمگائے نہ یقیں کبھی، نہ حوصلہ تیرا

منفرد ہے مانا پر یکتائی کا راز ہے کیا
روبرو اجل کے، ساحلؔ تجھے ناز ہے کیا
یارو، بسر کی ہے زیست سر بہ سجدہ، ہمیشہ
اس سے بڑھ کر کہو، کوئی انداز ہے کیا

جب خود کیا انتخاب تخلص کا تُو نے ساحلؔ
پھر، طوفانوں اور سمندر سے ہے ڈر کیوں تجھے
سیّارہ ہے تُو، شوق تجھے، خلا کا ہے بیحد
پرواز کے لئے تو ضرورت نہیں ہے، پر کی تجھے

سر بہ سجدہ رہوں میں ساحلؔ، کب تلک
اُمید کو رکھوں میں جگا کر، کب تلک
دل کی صدا کیا دفن ہوئی ہے زمین میں
وقت ساتھ دیگا میرا، بتا کب تلک

اعترافِ گناہ کروں نہ کروں، منصف
تیری عدالت سے بڑھ کر بارگاہِ خدا کی ہے
پوچھے گا جب مجھ سے میرا مولیٰ
بتا، سچ کے سِوا اور چارہ بھی کیا ہے

گوشے گوشے میں مہک گلستانوں کی ہے
گوشے گوشے میں خوشبو زبانوں کی ہے
ساحلؔ، دل سے نکلے لفظوں کی بات ہی کچھ اور ہے
فراست مندوں کی نہیں، بات دیوانوں کی ہے

زبانِ خلق تو بس جمہوریت ہے ذوقؔ
اِسے میں نقّارِ خدا کیسے سمجھو
انتخاب تو آج بس ایک سودا ہے، ساحلؔ
اسے چناؤ سمجھو یا سمجھو جنون

ساحلؔ کے چند اشعار

نہیں آنا مجھے ابھی ملنے تجھ سے، کر لے جو چاہے کر لے
یاد کرتا ہوں ہر روز یارب، تُو بھی تو کچھ صبر کر لے

چل رہا ہے ساحلؔ یارو، کاسہ بہ دست، دیکھو
شرمِ دامن گیر نہیں، کہ خدا پر ہے یقیں

اے شیخ و برہمن، مذہب زندگی نہیں ہے
راہ خدا کی دیر و حرم و کلیسا نہیں ہے

جو اپنی روح کی روشنی سے ہو نہ آشنا
وہ ظلمت میں بہہ کر ہو جائے گا فنا

آنسو نہ بہا اے دلِ ناداں
مرضِ الفت نہیں ہے مہرباں

مانتا ہوں ساحلؔ کہ روزِ پیدائش سے ہی
ایک مٹھی میں حیات اور ایک میں پیامِ طلبی ہے

اندھیروں کا رشتہ روشنی سے گہرا ہے
عداوت کا جیسے محبت سے ہے

کوئی محبت کرنے والوں کو یہ سمجھائے
کہ دل دے کر پھر واپسی نہیں ہوتی

جاتا ہے ساحلؔ تُو خوابوں میں کہاں
کس راحت کی تجھے تلاش ہے

میکدے کو جینا سیکھا دے ساقی
کبھی آ، اور مستئی دلِ ساحلؔ کو دیکھ

قفس میں ہوں، بال و پر نہیں، تو کیا ہوا
نام پرندہ ہے، خلاؤں کا ہوں میں سیّارہ

اُن انگلیوں کے لمس سے کیوں مئے چھلک گئی
کس کی تھیں وہ انگلیاں، کون وہ فسوں گر

طوفان ملے مجھے تو ساحل کے آس پاس
ساحلؔ، جنت قریب ہے کتنی دوزخ کے آس پاس

مجھ سے آ کر مل تنہائی میں میری، ورنہ
ہنگامے میں ساحلؔ تُو کھو جائے گا

ساحلؔ میرے قفس کے یہ نشاں کیا ہیں
زمیں اور یہ آسماں کیا ہیں

ساحلؔ، وہ بندگی ہی کیا جو بے کیف ہو
خدا ہو یا ہو مجازی صنم

ساحلؔ، نام اپنا تو وردِ زباں ہے
بھولا ہے انساں تو بس خدا کو

تیری امداد نہیں تیرا کرم چاہئے مولیٰ
کوشش تو ساحلؔ کی مکمل ہے

بے اثر سہی دعا میری، پر فرد ہوں میں تیرا
نہ پہنچے تجھ تک تو میں کیا کروں مولیٰ

بُت کدہ، صنم کدہ یا مابعد کوئی اور
ہم پوجتے ہیں اُسی کو ساحلؔ جو دل میں ہو بسا

ہم وقت سے مقابلہ کیا کریں ساحلؔ
وہ ٹھہرے ذرا تو کوئی بات بنے

کیا پوچھتا ہے ساحلؔ معیارِ محبت کیا ہے
اُس سے جس نے خود کو نہ چاہا ہو کبھی

کیا کیجئے اُس دل کا چھلکاتا ہے جو
جام خوشی کا ساحلؔ چشم پُر نم ہی سہی

رکھ نیک سیرت، بن جا تبّسم کا یار
مروّت کی جانب ساحلؔ، ہر انساں مایل ہوتا ہے

رنج و غم تو میری خود کی ایجاد ہے
ساحلؔ، خدا نے تو صرف مہر ہی بخشی ہے

اندھیرا راہ دِکھلاتا ہے اُجالے کی
ساحلؔ، دن میں ستارے کیا دیکھے گا

گِلے زندگی سے کیا، مقدر سے کیا
ساحلؔ، جب رضا خدا کی ہے تو شکوے کیا

کبھی طوفان کبھی موجوں سے کھیلتا ہے ساحلؔ
سہارا وہ سفینے کا، تماشائیوں کا بھی

نام خدا کا ہو وردِ زباں تو کیا
گر دل میں بستا ہو شیطاں ساحلؔ

فقیری کا مفہوم تو فقیر ہی جانے
تُو سمجھے گا شیخ تو مولیٰ کے در پر

زندہ تو ہے پر بد قسمت وہ کتنا
ساحلؔ، جسے خدا نے بھی نہ یاد کیا

کیا غم بھی کبھی دلچسپ ہوا، تو ہی بتا اے ساحلؔ
کیا آنکھوں میں تجھے راحت ملی، شاید لذّت بھی کبھی

نہ آنے نہ جانے کی ضرورت کہیں
زندگی تو بس بِتانے کے لئے ہوتی ہے

کیا سوچ کے رکھا تھا تُو نے ساحلؔ تخلص اپنا
بتا، سہارا ہے یا کنارا ہے تُو

نہ چاند کے لب پہ تبسّم نہ ہے عارض پہ آتش
اے خورشید، کیا جاگنے کے ارادے ہیں رات بھر تیرے

کبھی غم کی صدا سُنی نہ جس نے
کوئی خشک دل ایسا تو نہ ہوگا، ساحلؔ

ساحلؔ، مجھے رنگ تو دکھلا دے قوسِ قزاح کے
برق سے مقابلہ بھی کر لیں گے

معشوق کو گر مانا خدا تو خدا سے جا کر کہیں گے کیا
بتا ساحلؔ، تُو ہی بتا، محبت کا یہ نشہ ہے کیا

سُن گنبد کی صدا ، یا سُن فریاد دل اپنے کی
ایک جا ہے آواز تیری، ایک جا تیری روح ہے ساحلؔ

کسی اور راہ چل کر دیکھ لے، انتخاب کر کوئی اور
گلاب تو ساحلؔ گلاب ہی ہے، گلشن بھلے کوئی اور

ہر مرجھائی ہوئی کلی ساحلؔ، گواہ ہے اس بات کی
کہ جا چکی ہے بہار اب، دور خزاں کا ہے

آسان نہیں ہے غالب خود پے آنا کبھی
میدانِ جنگ یہ مشکل بہت ہے ساحلؔ

ساحلؔ، مشکل ہے بہت آئینے کا سامنا کرنا
آج ایک اجنبی نے مجھ کو میرا اصل چہرہ دِکھا دیا

تیرے کاخ و گلزار سے بہتر ہے کاسہ میرا
شیخ، دعائیں ملتی ہیں مجھے، تیری جھولی میں کیا ہے

چشم سے بہتے آنسو ہیں قیمتی بہت
ساحلؔ، غم کو نہ سجانا ان موتیوں سے تُو

جب ضبط کئے ہیں آنسو ہم نے، فلک سے پھر یہ بارش کیا
اُداس کیوں ہے آسماں، قسمت کی ساحلؔ ہے سازش کیا

طوفاں نہ آئے تو سکوں کیا ہو
حقیقت میں اُلجھے تو فسوں کیا ہو

دم نکلے جب ساحلؔ تو خوشی سے نکلے
ورنہ بتا، جنّت کیا حاصل ہوگی

وہ بہار ہیں ساحلؔ تو ہم خزاں کیوں
وہ گلاب ہیں تو ہم برگ بھی نہیں کیا؟

کبھی مشکل تو نہ تھا کرنا طوفان کا سامنا
اب تو ندی بھی سمندر سے وسیع لگتی ہے

نہ سمجھ پائی شعاع تیری وسعتِ مایوسی ساحلؔ
خورشید سے جا کہنے لگی، اندھیرا زیادہ ہے، کہیں اور چل

میدانِ جنگ ہے زندگی، غالب آنا مشکل ہے
تُو سر جھُکا کر چل ساحلؔ، زیست بنے گی دوست

محبت کر کے دیکھ لی، اب کیا بچا ہے زیست
ساحلؔ، بیوفائی ہر حال میں حیات کی فطرت ہے

غم دے اے زیست، تو مرہم بھی دے
ساحلؔ، جیسے موت ہر گام ہمسفر ہے تیری

رنگ ہولی کے پھیلاؤ صرف سُرخ نہیں
یارو، رنگ گلاب کے مختلف ہوتے ہیں

ساحلؔ، چہرے پہ تبّسم ہر حال میں ہو
کیا غم کو جس نے قابو وہی سکندر ہے

ساحلؔ ہر کرن آفتاب کی سہانی ہے بہت
نورِ خدا ہو دل میں جس کے، روحانی ہے بہت

گُل دے، شجر دے، برگ و بار دے
پہلے صبر دے مالک، پھر انتظار دے

ہم نے ناپا ہے راستہ مابعد سے میخانے تک
بتا ساحلؔ، تسکین کی تلاش اب کہاں ہو

وقت کی رفتار تو یکساں ہے ساحلؔ
تفریق ہے تو کفِ دست کی لکیروں میں

ساحلؔ، بے مراد ہے زندگی، گر ایماں نہ ہو
لب پر نام خدا کا اور زباں پر نہ ہو

ساحلؔ، حسیں خواب تو آخر خواب ہی ہیں
کون جانے جنت کے در، کس کی قسمت میں لکھے ہیں

بزمِ مَے، موجِ بادہ، حسین ساقی کا تصور
ساحلؔ، بے خودی کے علاوہ اور کیا چاہیئے

ساحلؔ، ہر لفظ گر دردِ دل کو چھو کر نکلے
اُس لمس سے شاید جہاں کے مسائل کا حل ہو

نہ بال و پر، نہ ہی پرندے کا ہُنر
ساحلؔ رکھتا ہے پھر بھی، تمنّا آسمانوں کی

برف ہے یا دل ہے، ساحلؔ گدازی کیسی
شبنم کی قطار ہے یا آنسوؤں کا دریا

سموم ہو یا صبا، بہار ہو یا خزاں
قافلہ تو نہ رُکے گا نہ ہی میرِ کارواں

دور اتنا بھی نہ جانا ماضی سے تُو ساحلؔ
کہ بےخبر ہو جائے پھر تجھ سے تیرا مستقبل

رنگ و بو سے رکھنا ساحلؔ واسطہ تو
گلشن بدلتے رہتے ہیں، موسم کا کیا ٹھکانہ

غضب ہے ساحلؔ اُس کا عروج و غروب
کہ لیتی ہے زیست سبق آفتاب سے

ساحلؔ، بنالے تبسّم کو ہمسفر تُو اپنا
آندھیاں تجھ کو دیکھ کر مسکرائیں گی

ظالم نہیں نرم دل ہے وقت، بس جلدی میں ہے ذرا
اُس کی موجوں کے ساتھ رہ رواں ساحلؔ، حاصل ہوگی منزل تجھے

صبح اور شام، گُل اور خار، حیات اور قضا
ساحلؔ، دوست ہیں کہ دشمن، ذرا سوچیئے

کبھی نام میکدے کا سکوں تھا ساحلؔ
یہ خانہ خراب کب ہوا، بتا

ساحلؔ، نبرد میں فتح پائی تو کیا جیتے
اپنی خامیوں پر غالب آئے، تو کوئی بات ہے

زمانے کی گردشوں سے باخبر ہیں ساحلؔ
اُمید نہ مہتاب سے، نہ ہے آفتاب سے اب کوئی

ساحلؔ، ہمسفر ہیں یہ زیست کی راہوں پر
عدو سہی، پر گہرا ہے رشتہ محبت اور نفرت کا

زندگی بڑی وہ ہے، اس سے دل نہ لگا بیٹھنا
ایک عارضی شے سے ساحلؔ پھر لگاؤ کیسا

ساحلؔ، اپنے اندر کے طفل کو نہ کھونا کبھی
زندگی بالکل بے معنی ہو جائے گی

دھوکا دے کر مجھ کو کیا پائے گا ساحلؔ کوئی
جب رہے گی اُسے پھر جستجو خود کی مستقل

نورِ خدا سے رکھ باطن میں رابطہ
اُس مصباح سے اے ساحلؔ، روشن رہے گی راہ

جب کافر ہوسکتا ہے انساں، ساحلؔ
تو پھر مغالطے کا شکار کیوں نہیں

در پر آ کر جو ہوا دستک دے پر ملے نہ
دے گی وہ تسکیں کیا، نسیم ہو یا ہو صبا

حُسن کو دُزدیدہ نگاہی سے ملے نجات
یا خدا کیا یہ بات ممکن نہیں

کاش ہل جائے وہ نقطہ جسے زندگی جسے خود ڈھونڈتی ہے
حیات جب پوچھتی ہے خود سے، بول میرا وجود کیا ہے

سُپردِ اُمید کر گئی ہے اندھیری رات، آج
ساحلؔ، مرضی اب آفتاب کی ہے اور رضائے خدا

حکمِ ناطق میں لکھا تو بہت ہے ساحلؔ
پر اس انساں کو حق سمجھائے کون

کیا دوگے دوستو، دعاؤں میں رہوں تو بہت ہے
ساحلؔ، خدا کی عنایت مجھ پر بہت ہے

جان لیوا ہوتی ہے تمنّا ساحلؔ
گر لگام دستِ ہوس میں ہو

اے نا انصافِ مقدر اتنا تو بتا دے
کیا تجھ کو خبر ہے اپنی، فکر میری مت کر

لطف کیا ہے طنز میں، قسمت کو کیوں کوستا ہے
کمی تو ساحلؔ تجھ میں ہے، باطن میں تو جھانک ذرا

میرے دامن کے داغوں پر تبصرہ کیسا
ساحلؔ، ہر زندگی کا یہی تو تماشا ہے

صدائے احتجاج کو خموش مت ہونے دینا
ساحلؔ، استبداد کی شروعات وہی ہوتی ہے

کور چشم کو دکھائے راہ، باطن کی روشنی
ساحلؔ، جو دیکھ سکے پر دیکھے نہ، لَو اُس کی ہے کون

بتا اُمید کیا رکھوں اس سے میں ساحلؔ
زندگی تو خود قضا کی مہمان ہے

آسان نہیں ہے چلنا راستی کی راہ پر
ساحلؔ، مومن ہوئے ہیں لوگ مگر مشکلوں کے ساتھ

ساحلؔ، گر رُک بھی جائے وقت تو کیا ہے
دل تو ہر بشر کا گامزن ہوتا ہے

سوتا ہوں تو یادِ ماضی میں کھو جاتا ہوں
آسودگی میں بھی ساحلؔ عجب غم ہے پنہاں

عقاب نہ سہی، بال و پر نہ سہی، پروزا تو ہم بھی کر لیتے
گر ذات خاک نہ ہوتی ساحلؔ، زمیں سے یہ الفت نہ ہوتی

جب باطن کی روشنی بنی کہکشاں میری
راہ زندگی کی ساحلؔ ہوئی پُر تاباں میرں

اب تو جا چکے ہیں ساحلؔ، ساحل سے بہت دور
سمندر ہے ہمسفر، نم چشم اور آب

مفہومِ غم نہ سمجھا، ساحلؔ دل کا رونا ہی بہت ہے
کیا کریں گے ہم جان کر، جب شب کو سونا بہت ہے

جو معجزہ کا رہتا ہے منتظر ساحلؔ
وہ نہ سمجھا ہے خدا کو نہ ہی اُس کا نظام

عرشِ بریں میں ہے شعبدہ باز، اعلیٰ
شیخ، تُو تو ایک عام مداری ہے، بس

اے مشفقِ من کیوں ڈوبا ہے تُو خلوت غم کی دنیا میں
ذرا آنکھ تو کھول، باطن میں جھانک، رونق پھر خلوت کی دیکھ

مہماں ہیں سب جہاں میں، میزباں تو ایک ہے
ساحلؔ، منزل سب کی وہی ہے، رب کی بارگاہ تو ایک ہے

ساحلؔ آئینہ تو بس آئینہ ہے، حسن تو ہے ایک عکس
خود کی ہے پہچان اُسے، حقیقت نگار ہے وہ

تجھے یاد کرے گی ساحلؔ تو بس صبائے صبح
چاند ستاروں کو بھلا فرصت کہاں ہے

ساحلؔ ہر دل میں تمنّا جاوِدانی کی ہے
یہ زندگی تو جی لے، خواب پھر دیکھ لینا

سوغات کیا، نام کیا، کھنڈر ہے مجسمہ
وقت کا ایک جھونکا بھی بن جاتا ہے زلزلہ

میں تکتا ہوں اسے، وہ مسکراتا ہے کیوں
اے میرے شجر، تُو کوئی کاہن ہے کیا

دل سے کر کے گفتگو، ارادے بنائے ہزار
ساحلؔ، اُن کے حضور میں کیوں زباں رہی خاموش

ساحلؔ، کسی کا دل جلتا ہے کیا، یا ہے یہ دودِ چراغاں
زمین سے چل کر یہ دھواں، کیوں چومتا ہے اب آسماں

ساحلؔ، توقع بھی جذبہ ہے کیسا، مت پوچھئے
حسرت و تمنا نہ ہو، تو ویرانی ہو رو برو

ضروری ہے تیرا رابطہ، ماضی سے اے ساحلؔ
مستقبل کی کیا خبر، گزرا لمحہ بھی ماضی ہے

جلنا اور بُجھنا تو شمع کا پیشہ ہے، بس
اے ہواؤ ساحلؔ کی مانو، تم یوں ہی چلتی رہو

تفصیل سے کیا بتائیں تمہیں چاہتا ہوں میں جاناں
تمہیں فرصت ہے کہاں اور ہماری زباں ہے خموش

بُت خانہ، میکدہ، عبادت کے نشیمن
رب ملتا ہے بس جنوں سے یارو

از خود دیا بیاں گنہگار ہوں منصف
دل اپنے میں جھانک کر پھر دینا سزا

کارواں ہے زندگی، میر ہے خدا
شب و روز کا یہ سفر سب کا ہے جُدا

ہم نے دیکھی ہیں بہاریں خزاں میں بھی
جب بھی ہمت نہ ہاری نہ اعتماد کم ہوا

محبت میں سودائی ہوتے ہیں، سوداگری نہیں
ہوتے ہیں اُصول تجارت کے مختلف

عرقِ گلاب ہو یا پھر ہو زوفہ
یارو، عبادت کے لئے بس دل صاف چاہیئے

رہنما بننے سے پہلے خود کو راہ تو دکھالے
شیخ، ارادے ہوں پختہ، پھر ان راہوں پر چل کر دکھادے

موت سے خائف کیوں وہ تو بلکہ نجات ہے
ساحلؔ، حیات ہی بیڑیاں پہنائے رکھتی ہے

مقدر سے ہار تو بزدلی ہے ساحلؔ
ہم نے تو قسمت کے ارادے بھی بدلے ہیں

دین، بے دین، ساحلؔ یہ سب انسانی ایجاد ہے
خدا سے مل کر پوچھئے، تفریق اس نے کی ہے کیا

ہر صبح نئی امید، ہر شام ایک اُداسی
یہ آفتاب بھی کیسا مداری ہے

وادیاں، نسیم و صبا، طوفان دیکھے
اب، پوچھو زندگی سے کیا دکھانا باقی ہے

ساحلؔ وہ دورِ اطفال، وہ ماں کا گہوارہ
وہ ننھا سا بازیچہ، آج ایک ہتھیار ہے ناداں ہاتھوں میں

چلتی رہ تُو اے نسیم، سموم کا بھی ہے استقبال
کوئی تو پاسباں ہو ساحلؔ، بادِ زُمہریر کے خلاف

اپنی بے خودی میں کر، فکر اوروں کی شامل
دوا اور دعا ساحلؔ، اسی میں ہیں

ساحلؔ، بات وجد کی ہو تو دوست بے شک ہم سے پوچھ
معاملے جو سیاسی اور پیچیدہ ہیں، جا فراست مندوں سے پوچھ

وقت کا وجود بھی مجھ سے ہے، اے ساحلؔ
گر میں نہ رہوں تو پھر میرا وقت کیا ہے؟

گر کھو گئے ویرانی میں تو کیا ہوا، ساحلؔ
گمراہ ہوئے وجدانی میں تو کوئی بات ہے

خدایا، کرم تیرا ہے مستقل، ہے سب تیری عطا
بدلی کروٹ جب قسمت نے، ساحلؔ کی ہے خطا

ناسمجھ پائی شعاع تیری وسعتِ مایوسی ساحلؔ
خورشید سے جا کہنے لگی، اندھیرا زیادہ ہے، کہیں اور چل

خوگر نہ بن جانا عضر کا ساحلؔ کبھی
بارگاہِ حق میں کیا کرے گا پھر

تنہائی کا شوق تھا ساحلؔ تجھے، کچھ سکوں بھی ملا، پر
وہ دوستی کا خانہ دل میں ہے خالی، دل کچھ محروم

غم دیا مستقل تو یارب، پھر کر جنت کا وعدہ
ساحلؔ، نہ سہی گلفام وہاں، پر ہو مَے نام کا بادہ

وہ لمس ہی کیا روگوں میں گر رواں نہ ہو لہو
وہ زلف ہی کیا ساحلؔ بتا جسے چھو کر برق نہ بنے

الفت نہ سہی مروّت ہی سہی
ساحلؔ، خدا مصروف ہو گر تو جنت ہی سہی

آنکھوں ہی آنکھوں میں تجلّی ہے ساحلؔ
آج دل تو سب کے جل بجھ چُکے ہیں

رگ رگ میں رواں ہے خوشی جا اُسے تُو مل
منتظر کیوں تُو بہار کا، بتا مجھے ساحلؔ

دل میرا ہے زنداں ساحلؔ، اسیر میرا ہے رب
جب چاہوں میں رہا کروں، جب چاہوں میں قید

خلوتِ ویرانی میں سکوں کیا ہے ساحلؔ
طوفاں میں مثلِ ساحل بن، تو کوئی بات بنے

نہ بن سکے غالبؔ تو ساحلؔ، پھر کیا ہوا
بن کر دِکھا ساحل جہاں کو، سکوں کا مجسّمہ

ظلمت اتنی ہے جہاں میں یارب، کورچشم ہیں تیرے لوگ
ساحلؔ، باتیں ہوتی ہیں نورافشانی کی، جب آفتاب جھجکتا ہے نکلنے کو

غمِ فرقت، لطفِ وصال ہی نام ہے زیست کا
فاصلہ بس اتنا ہی ہے ساحلؔ، موت اور زندگی میں

تیرے کرم پر قائم ہے یہ دنیا اور یہاں کے لوگ
مانا بھٹک گیا ہے انساں یارب، تُو نا اُمید مت ہونا

مولیٰ ، بے خودی میں جو سکوں تیری یاد میں ہے
تیرا وجود کیا میری بے خودی میں ہے

جستجو راحتوں کی کیوں، کیا مابعد وخمگاہ کافی نہیں
کیانجات تجھ کوچاہئے زیست سے ساحلؔ،ارماں اجل کا کیوں

ساحلؔ، ہجر و وصال تو میزاں کے دو پلڑے ہیں
جیسے عروج و غروب ہیں فطرتِ آفتاب

مے پِلا ساقی، صبح ہو یا شام
نظروں سے پِلا دوست، ٹوٹ جاتے ہیں جام

بادِ مرگ بھی یاد آئے گا یہ جہاں، ساحلؔ
بے خبر ہوں میں لطفِ فردوس سے

ساحلؔ، فلک کی نہیں مہر خدا کی چاہئے
آفتاب، ابر و باراں، ماہ وانجم بھی تو اُسی کے ہیں

نا ممکن ہے جینا بن مصیح ساحلؔ
درماں ہی نہ ہو تو کیا کیجئے

تیری آہ میں طوفاں، تلاطم وہ زبردست
جانے گی دنیا ساحلؔ، تجھے، بادِ مرگ تیرے

شاطر کون ہے بتا ساحلؔ، حیات یا قضا
ایک جو برسوں جیتی ہے اور ایک جو ہے لمحہ

غمِ فراغ میں ڈوبا ہے ساحلؔ بتا تو کیوں
جب نازک ہے رابطہ زیست و قضا کا

غم ہمسفر نہ ہو تو امید کیا کرے
اور بن امید ساحلؔ پھر زندگی کیا کرے

رشتے ناتے کفن تک نہیں، زیست بھی کیا ظالم ہے ساحلؔ
جو پھول چڑھانے آتے ہیں، وہ ماضی میں کھو جاتے ہیں

وعدے نہ کرنا ساحلؔ، ضامن بنے گا کون
ذرّۂ خاک ہے انساں، کہو خاک سے کیا ہے امید

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا، جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
افسوس 'مومن' ساحلؔ کے دل میں رب ہے مستقل، وہ تنہا نہیں ہوتا

بہلالے دل کو خلاؤں سے، اے ساحلؔ تُو
مضطر بہت ہے دنیا، مضطر ہے تیرا دل

فرق کیا ہے ساحلؔ، دھواں اور دُخاں میں
ایک کا رشتہ شمع سے ہے اور ایک کا دل سے

کبھی گفتار زندگی سے کر کے دیکھ ساحلؔ
خوف قضا سے اُسے، تجھ سے مزید

شور و غل نہیں ہے کوئی مثلِ خاموشی
خالی پن کا احساس بھی ساحلؔ زباں رکھتا ہے

زمین کے ستارے تو فانی ہیں ساحلؔ
تُو خلا میں ستارا بن کر دکھا

گر پھنس گیا گرداب میں، تو ساحل ہے منتظر
غم میں ڈوبا ساحلؔ تو، پھر کون ہوگا سہارا

سنجیدہ نہ رہوں تو لطف یاروں کو ملنے میں کیا
ہوشمند ہوں ساحلؔ، کوئی دیوانہ نہیں

قسمت کیا جانے حد ناانصافی کی
ساحلؔ، تقدیر ہے وہ، کوئی منصف نہیں

صبح و شام کا تماشا، بس عروج و غروب
ساحلؔ، بے مانی بے سبب ہے کیا، آفتاب کا سفر

تُو خاک ہے ساحلؔ، بو لے تخم گلاب کے
مہکے گی پھر زمین سے تیری، خوشبو ایک دن باغ کی

دلاسے نہ دیں لوگ تو بہتر ہے ساحلؔ
درماں زخمِ دل کا تو وقت ہی ہے

ساحلؔ محنت میں پنہاں سکوں بہت ہے
عرقِ مشقت سے بنا لے سمندر تُو اپنا

میرا وقت میرے ہی وجود کی ایجاد ہے
بادِ مرگ میرے ساحلؔ ، یہ کیا ہوگا ؟

پیمانۂ محبت نہیں ساقی، اب تو جام پیری کا پلا
بہت دور جا چُکا ہے ساحلؔ، منجدھار کے اُس پار

قرار بھی ایک پرندہ ہے، خلا میں اور کبھی قریب
ساحلؔ اُڑتی ہوئی شے ہے وہ، ہواؤں کی طرح

اے زندگی، سکون تیرا کدھر گیا، کیوں ڈگمگا رہی ہے تُو
ساحلؔ، غروب ہونے کو ہے خورشید، کل صبح کی کسے خبر